اُردو ہندی

(ایک تاریخی جائزہ)

ترتیب وتالیف:

جاوید اختر بھٹی

ضابطہ

نام کتاب : اردو ہندی (ایک تاریخی جائزہ)

مرتب : جاوید اختر بھٹی

ناشر : دارالکتاب، کتاب مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور

طابع : مکی مدنی پرنٹرز، لاہور

سن اشاعت : جون 2004ء

قیمت : 120 روپے

قانونی مشیر ________ باہتمام

مہر عطاء الرحمن، ایڈووکیٹ ہائی کورٹ، لاہور

فون: 0300-4356144, 7241866

حافظ محمد ندیم

زبانوں کے دوستانہ مراسم

کے نام

اور

اُردو کے نام

ترتیب

ضمیمہ:

ooo

حرفِ آغاز

پاکستان اور برصغیر میں اُردو رابطے کی سب سے بڑی زبان ہے، اسے پہلے ہندی ہندوستانی کے نام پر تباہ کرنے کی کوشش کی گئی اور اب قوم پرستی کے نام پر اس کے ساتھ نفرت کا اظہار کیا جاتا ہے۔ کراچی کے واقعات نے بھی اُردو سے دُوری کی صورت پیدا کی لیکن اس کے باوجود، اس میں قائم رہنے کی صلاحیت موجود ہے۔

اُردو کے علاوہ اور کوئی زبان یہ صلاحیت نہیں رکھتی کہ وہ پاکستان کے اندر اور پاکستان اور ہندوستان کے درمیان رابطے کی زبان بن سکے۔

اب اُردو میں ''اہل زبان'' کا خاص قسم کا تعصب بھی باقی نہیں رہا کیونکہ زبان نہ اب اس انداز بولی جاتی ہے اور نہ ہی لکھی جاتی ہے۔ اُردو کے دعوٰی دار اب پاکستان کے تمام صوبوں میں آباد ہیں، نہ ان کی زبان پہلے جیسی رہی اور نہ ہی اُردو کی کیفیت پہلے والی ہے اس میں بہت سے لفظوں کا مسلسل اضافہ ہو رہا ہے، جس تیزی کے ساتھ اُردو نے نئے لفظ قبول کیے ہیں، کسی اور زبان نے قبول نہیں کیے۔

جب ہم رابطے کی زبان سے نفرت کا اظہار کرتے ہیں تو دراصل ہم اپنے لیے مشکلات پیدا کرتے ہیں۔ یہ مشکلات ان مشکلات کی ہم شکل ہیں جو ۱۹۴۷ء سے پہلے ہندوستان میں پیدا کی گئیں۔ اُردو نہ پہلے کبھی غیر زبان تھی اور نہ اب ہے البتہ کبھی کبھی اس کے ساتھ غیروں جیسا سلوک ضرور کیا جاتا ہے۔ یہی ایک غلط فہمی ہے جس کا اُردو بار بار شکار ہوئی۔ جس زبان نے پاک و ہند میں خوب صورت ادب تخلیق ہوا ہو، وہ غیر کیسے ہو سکتی ہے۔

اقبال نے اُردو کو پنجاب میں سربلندی عطا کی اور اس کے ساتھ اُردو شاعری کا مرکز پنجاب بن گیا۔ اُردو ادب کی چھاپ پاکستان کی تمام زبانوں میں دکھائی دیتی ہے۔ اسے زبانوں کی دوستی کا نام دیا جا سکتا ہے کیونکہ زبانوں کے دوستانہ مراسم ہمیشہ سے رہے ہیں۔

اس کتاب میں کوشش کی گئی ہے کہ ہندوستان کے ماضی کی ایک جھلک دکھائی جائے جب اُردو کو ختم کر کے سنسکرتی ہندی کو رائج کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی اور پھر تقسیم ہند کے بعد آپ دیکھیں گے کہ اُردو کا خاتمہ کر دیا گیا اور اس کی حمایت کو جرم تصور کیا گیا لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا۔ اُردو نے ایک بار پھر اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کر لیا۔ اس بات کا پتہ ہمیں جدید الیکٹرانک میڈیا نے دیا کہ اُردو ہی وہ زبان ہے جو پاکستان اور ہندوستان کے درمیان رابطہ قائم رکھ سکتی ہے۔

جاوید اختر بھٹی

۵ر دسمبر ۲۰۰۳ء

۱/۵۱۷ ریلوے روڈ، ملتان

ooo

مقدمہ

(۱)

اُردو زبان وادب کے لیے ڈاکٹر گیان چند کی خدمات قابلِ قدر ہیں۔ ان کے کام کو ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا لیکن ان کی کتاب ''لسانی مطالعے'' ایک اعلیٰ تحقیقی اور علمی کام ہونے کے ساتھ ساتھ جانبدارانہ نقطۂ نظر کی سمت سفر کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ اس کتاب کے ماتھے پر ''وزارتِ تعلیم حکومت ہند'' چھپا ہوا ہے۔ سرکاری سرپرستی تحقیق اور علم کا رُخ موڑ دیتی ہے اور جس کتاب کے ماتھے پر سرکاری ستارا چمک رہا ہو، اس کا مصنف کسی سرکاری ادارے میں ملازم ہو، ملازمت کا تعلق خواہ درس وتدریس کے مقدس فریضے سے ہی کیوں نہ ہو۔ ایسی کتاب سے یہ خواہش رکھنا کہ اس میں انصاف کیا جائے گا اسے آپ ایک خوش گمانی کے سوا کچھ نہیں کہہ سکتے۔

ڈاکٹر گیان چند بڑی محنت سے ایسے حوالے تلاش کرتے ہیں، جن سے ان کے سرکاری موقف کو تقویت ملتی ہے۔ اردو ہندی کے حوالے سے بہت سی کتابیں دیکھی ہیں۔ اس کتاب کی تالیف کے وقت انہیں ایک بار پھر دیکھا۔ وہاں مجھے اردو اور ہندی کی محبت تو ضرور نظر آئی ہے۔ مگر یہ محبت ذاتی ہے اس میں نہ تو سرکاری ملازمت کا دخل ہے اور نہ ہی کسی سرکاری اشاعتی ادارے کی پُرکشش رائلٹی کی چمک ہے۔

ہندوستان میں اردو کی مخالفت میں جو خدمت ڈاکٹر گیان چند نے انجام دی ہے۔ پاکستان میں وہی خدمت ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے ایک اردو پرست کے طور پر انجام دی۔ اردو کے دفاع میں انہوں نے ایک بڑی کتاب تالیف کی۔ اس کتاب کے ماتھے پر ''ایمان، اتحاد، نظم''

روشن ہے۔

ڈاکٹر گیان چند کی طرح ڈاکٹر فرمان فتح پوری بھی سرکاری ملازم رہے اور ان کی کتاب بھی ایک سرکاری ادارے نے شائع کی ہے۔ رائلٹی کی چمک اس طرف بھی ہے۔ لیکن کانگریس کی جو دلچسپی اور جدو جہد اردو زبان کے خاتمے کے لیے نظر آتی ہے۔ وہ مسلم لیگ میں دکھائی نہیں دیتی۔ اردو کی بدنصیبی تو یہ ہے کہ مسلم لیگ کو اس کے دفاع کا بھی خیال نہ آیا (۱)۔ جبکہ کانگریس نے ہندی کو زندہ کرنے کی ایک بڑی کوشش کی۔ جس میں انہیں تاریخی کامیابی حاصل ہوئی۔ اس زبان کی زندگی کو تقسیم کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔ ہندوستان بعد میں تقسیم ہوا اور زبان پہلے تقسیم ہو گئی۔

میرا خیال ہے کہ گاندھی جی اردو کے لیے اس قدر تعصب سے کام نہ لیتے تو شاید ہندو مسلم نفرت اس انداز میں جنم نہ لیتی جس کا خمیازہ ہم اب تک بھگت رہے ہیں۔ گاندھی جی کو چاہیے تھا کہ وہ ہندوستان کی تمام زبانوں سے ایک طرح کی محبت کرتے، لیکن اردو ان کی مہاتمائی سیاست کی بھینٹ چڑھ گئی۔ کاش وہ ہندوستان کی زبانوں کو آزاد رہنے دیتے مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ انہوں نے ہندی کی بالادستی کی خواہش میں باقی تمام زبانوں کو غلام بنا لیا۔ جس میں اردو سرفہرست ہے۔

ہندوستان ایک بڑی جمہوریت ہے اس کی اقدار اپنے اندر صدیوں کی قدامت رکھتی ہیں (پاکستان کو قدامت سے بھی حصہ نہیں دیا گیا۔ جو ادھر ہیں قدامت کی وراثت انہیں کے حصے میں آئی) ڈاکٹر گیان چند نے اس موضوع پر ڈاکٹر فرمان فتح پوری سے پہلے لکھا (ڈاکٹر گیان چند کی کتاب ''لسانی مطالعے'' کا پہلا ایڈیشن ۱۹۷۳ء میں شائع ہوا جبکہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی کتاب ''ہندی اردو تنازع'' ۱۹۷۶ء میں پہلی بار منظر عام پر آئی) اس لیے پہلے انہی کی کتاب سے فیض حاصل کیا جائے۔ چند اقتباسات پیش کرتا ہوں۔ جس سے اندازہ ہو گا کہ اردو ادب کے نامور نقاد اور ماہرِ لسانیات ڈاکٹر گیان چند اردو کے لیے کیا رائے رکھتے ہیں۔

''لسانیات میں اردو کا کیا مقام ہے اس کا اندازہ ہر سال گرمیوں میں منعقد ہونے والے گرمائی اسکول لسانیات سے ہوتا ہے۔ ان میں تقریباً سوا سو متعلم شرکت کرتے ہیں۔ پانچ سات کے علاوہ یہ متعلم دراصل کالجوں اور یونیورسٹیوں کے کسی زبان و ادب کے شعبے کے اساتذہ ہوتے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ تعداد ہندی کے معلموں کی ہے اور سب سے کم اردو کے، اردو

والے دو یا تین سے زیادہ نہیں ہوتے۔ یہ واضح ہو کہ نصاب کسی مخصوص زبان سے وابستہ نہیں ہوتا۔ درس صرف انگریزی زبان میں دیا جاتا ہے۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ جنوب کی چار ریاستوں مہاراشٹر، گجرات وغیرہ میں ہندی کے پڑھانے والے انہیں ریاستوں کے اصل باشندے ہوتے ہیں۔ مدارس یونیورسٹی کا شعبۂ ہندی تامل بولنے والے اساتذہ پر مشتمل ہے تو میسور بنگلور کا کنڑ بولنے والوں پر۔

لسانیات اسکول میں تمام زبانوں اور ریاستوں کی نمائندگی ہوتی ہے۔ وہاں اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان میں لسانیات کے بڑے علماء غیر ہندی والوں میں سے ہیں۔ ہندی والے نہیں۔ طلبہ میں بھی (جو دراصل اپنی درس گاہوں میں لکچرز ہوتے ہیں) دوسری زبان والوں کو لسانیات میں جو دخل اور درک ہوتا ہے وہ ہندی والوں کو نہیں ہوتا اور اس کی خاص وجہ انگریزی کا ذریعۂ تعلیم ہونا ہے۔ یہ طے ہو جانے کے بعد کہ ہندی والے لسانیات میں کئی دوسری زبانوں سے پیچھے ہیں ہندی اور اردو کا مقابلہ کیا جاتا ہے۔

مختلف یونیورسٹیوں سے ایم۔اے ہندی کرنے کے بعد ہندی کے کسی لسانیاتی موضوع پر پی ایچ ڈی کرنے والوں کی تعداد دیکھئے وہم و قیاس سے زیادہ ہوتی ہے۔ آگرہ یونیورسٹی کی فہرست نظر سے گزری جس میں اب تک ہندی میں پی ایچ ڈی کرنے والوں کے نام اور موضوع بھی دیے تھے اور ان کی بھی جو آج کل محوِ ریسرچ ہیں۔ اس فہرست میں لسانیات کے اتنے زیادہ اور اتنے متنوع موضوعات تھے کہ دیکھ کر ہوش پرّاں ہو گئے۔ ہندی کی بولی اور کوئی اہم مصنف باقی نہیں جس کا لسانیاتی مطالعہ نہ کیا گیا ہو۔ کسی کالج یا یونیورسٹی کی لائبریری میں ہندی کا سیکشن دیکھئے موٹی موٹی جلدیں رکھی ہوں گی سور کی بھاشا، تلسی کی بھاشا وغیرہ۔ اردو میں کسی ادیب کی زبان پر ایک کتاب نہیں۔ بلا مبالغہ اردو اور ہندی میں لسانیاتی کتابوں کا تناسب ایک اور پچاس کا ہوگا اس سے کم نہیں۔

اردو میں لسانیات کی قابلِ ذکر کتابیں ہاتھوں کی انگلیوں پر گنی جا سکتی ہیں اور یہ جس موضوع پر، جس معیار کی ہیں ہندی میں اس موضوع اور اس معیار کی کتابیں اردو کتابوں سے کم از کم تیس سال پہلے وجود میں آ چکی تھیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ ہندی کو تو سرکاری سرپرستی حاصل ہے، اس کا ہر طرف بول بالا ہے۔ اردو کو کون پوچھتا ہے؟ لیکن پاکستان میں تو اردو کو سرکاری پشت پناہی بھی حاصل ہے۔ ہم اردو کے ذخیرے پر نظر کرتے ہیں تو ہند و پاک دونوں کی تحریروں کو شامل

کرتے ہیں کیونکہ ابھی تک اردو ادب کی تقسیم نہیں ہوئی۔ ہند و پاک کا اردو ادب ایک اکائی ہے۔ اس طرح لسانیات کے باب میں اردو کے بے نہایت افلاس کے سبب اردو میں لسانیات کا ذکر و فکر کی اَشد ضرورت ہے۔''

(لسانیات کے مطالعے کی افادیت)

''اردو اور ہندی کے مسئلے پر سائنسی غیر جانبداری سے کم اور جذباتیت سے زیادہ غور کیا گیا۔ یہ علمی مسئلہ فرقہ وارانہ سیاست کا ایک شاخسانہ ہو کر رہ گیا۔ لیڈروں کو چھوڑیے، اس موضوع پر جب ہم اردو اور ہندی کے جید علماء کی تحریریں پڑھتے ہیں تو ان میں علمی دلائل کے ساتھ طنز و تشنیع کی ایسی بوچھار، درپردہ مذہبی حملوں کا ایسا طوفان اور حقارت کے ایسے شعلے دکھائی دیتے ہیں کہ یہ فیصلہ نہیں ہو پاتا کہ دونوں گروہوں میں کون زیادہ زہر اُگلتا ہے۔''

OOO

''آزادی اور تقسیم ملک کے بعد ہندی اور اردو کی آمیزش ختم ہو گئی۔ ہندوستانی بھی مہاتما گاندھی کے ساتھ ختم ہو گئی۔''

OOO

''انیسوی صدی کے ربع آخر میں ہندی اردو کا قضیہ کھڑا ہو گیا۔ جس کے ردِ عمل کے طور پر ہندی کو سنسکرت آمیز بنانے کا رجحان زور پکڑتا گیا۔ علی گڑھ تحریک نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ اب اردو ہندی دونوں کا ارتقاء متضاد سمتوں میں ہو رہا تھا۔ یہ گلہ بے جا ہے کہ کون غلطی پر تھا۔''

(اردو اور ہندی کا لسانیاتی رشتہ)

''ہندی اور اردو بول چال کی سطح پر بالکل ایک ہیں، لیکن علمی اور ادبی سطح پر کبھی ایک دوسرے کے لیے قابلِ فہم رہتی ہیں کبھی نہیں۔ پاکستان ریڈیو کی اردو خبریں ہندی جاننے والوں کے لیے اور آل انڈیا ریڈیو کی ہندی خبریں پاکستان کے اردو دانوں کے لیے کافی حد تک قابلِ فہم ہوتی ہیں، لیکن ذرا مشکل۔ اردو شاعری ہندی والوں کو اور ہندی شاعری اردو والوں کو بہت کم سمجھ میں آتی ہے۔ اس معیار پر انہیں ایک زبان تو مانا جائے گا، لیکن دو بولیاں کہا جائے گا۔''

OOO

''۱۹۴۷ء یا ۱۹۴۸ء میں سردار جعفری اردو کے ترقی پسند مصنفین کی طرف سے ہندی

کے ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس میں ایک تحریری پیش کش لے کر گئے تھے۔ کہ ہم اردو کے لیے دیوناگری اختیار کرنے کو اور اسے ہندی نام دینے کو تیار ہیں بشرطیکہ ہندی والے پورے اردو ادب کو ہندی میں شامل کرلیں۔ اس پیش کش پر جوش تک نے دستخط کردیے تھے، لیکن ہندی ساہتیہ سمیلن کے دو سابق صدروں نے امرناتھ جھا اور راہل سانکرتاین نے اس پیش کش کو رد کر دیا۔ شاید انہیں اندیشہ ہو کہ اردو ادب کے ہندی ادب میں شامل ہو جانے کے بعد اردو اسلوب کی مقبولیت ہندی اسلوب پر غالب آجائے گی۔''

OOO

''اردو کی ابتداء کے بارے میں اہل اردو کا کہنا ہے کہ اردو مسلمانوں اور ہندوؤں کے اتحاد کی پیداوار ہے۔ ہندی کے مشہور ادیب ڈاکٹر رام بلاس شرما اپنی کتاب ''بھاشا اور سماج'' میں اس کی پرزور تردید کرتے ہیں کہ مسلمان تو دِلّی میں بارہویں صدی میں آگئے تھے، لیکن اردو کی ابتداء شاہجہاں کے عہد میں ہوتی ہے۔ کیا دونوں ملتوں کا ملنا جلنا اس سے قبل نہ تھا۔ پھر وہ دکنی کے ابتدائی روپ کے نمونے پیش کر کے کہتے ہیں کہ شروع میں اردو ہندی میں کوئی فرق نہ تھا۔ اردو کا ارتقاء ہندی سے روز افزوں مغائرت اور ایرانی تہذیب سے بڑھتے ہوئے اتحاد کی کہانی ہے۔ ابتدائی اردو میں اگر ۱۵ فی صدی عربی فارسی الفاظ اور ۸۵ فی صدی ہندی الفاظ تھے۔ تو انیسویں صدی کی اردو میں ۸۵ فی صدی عربی فارسی اور ۱۵ فی صدی ہندی الفاظ رہ گئے یعنی اردو مسلمانوں کے ہندوؤں سے میل کی نہیں افتراق کی نشانی ہے۔''

OOO

''آخر میں مجھے یہ اعتراف کرنے میں باک نہیں کہ اہل اردو لاکھ واویلا کریں کہ جدید ہندی اردو کی نقل کر کے بنی ہے۔ جدید ہندی کسی علاقے کی بول چال کی زبان نہیں، لیکن اس کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ کروڑوں لوگوں نے (اردو سے بدرجہا زیادہ نے) ہندی کو اپنا لیا۔ اسے اپنی تہذیبی، ادبی اور علمی زبان مان لیا ہے۔ اس میں علم و ادب کی تخلیق اردو سے کہیں زیادہ ہو رہی ہے یہ مرکز اور کئی ریاستوں کی سرکاری زبان ہے۔ ہمیں اسے سیکھنا ہے ہم اسے اغماض نہیں کرسکتے۔''

(اردو ہندی)

''ملک کی تقسیم نے اردو، ہندی، ہندوستانی کا قضیہ طے کر دیا۔ اردو پاکستان کی قومی

زبان بنی، ہندی ہندوستان کی۔ روایت کی جاتی ہے کہ مجلس آئین ساز کی کانگریس اسمبلی پارٹی میں بحث اُٹھی تھی کہ ملک کی زبان ہندی ہو کہ ہندوستانی برائے نام اکثریت سے ہندی کے حق میں فیصلہ ہوا۔ تقسیم ملک سے پہلے کی فرقہ وارانہ سیاست اور تقسیم کے بعد پاکستان کے جارحانہ رویے کی ہیبت اس طرح دلوں پر طاری تھی کہ آئین ساز اسمبلی نے اتفاقِ رائے سے ہندی کو ملک کی سرکاری زبان تسلیم کرلیا۔"

(زبان کا مسئلہ)

ڈاکٹر گیان چند کی کتاب "لسانی مطالعے" سے جو اقتباسات پیش کیے گئے ہیں۔ ان پر غالباً تبصرے کی ضرورت نہیں۔ وہ اردو کے لیے مایوسی کا اظہار کرتے ہیں اور ہندی کے لیے بہت زیادہ پر اُمید دکھائی دیتے ہیں۔ اردو کے افلاس پر ان کی گہری نظر ہے اور ہندی کی وسعتوں نے اُنہیں حیران کر دیا ہے۔ ہندی کی چکا چوندھ میں اُنہیں اردو دکھائی نہیں دے رہی۔

اردو اور ہندی کا جھگڑا حقیقی نہیں تھا۔ یہ فساد سیاست دانوں نے پیدا کیا، اسے کانگریس کے ذہن کی پیداوار بھی کہا جا سکتا ہے۔ گاندھی نے اس فساد میں سب سے زیادہ دلچسپی لی اور نمایاں کردار ادا کیا۔

ہندوستانی سیاست میں نفرت اور تعصب کے کھیت کاشت کیے گئے۔ ان کھیتوں کو کھاد اور پانی کی جگہ انسانی خون دیا گیا۔ جس ملک میں ہندو پانی، مسلم پانی ہو۔ وہاں ہندو زبان اور مسلم زبان کیوں نہ ہو؟

ڈاکٹر گیان چند جیسے بڑے دانشور کے قلم سے یہ افسوسناک الفاظ رقم ہوئے:

"تقسیم ملک سے پہلے کی فرقہ وارانہ سیاست اور تقسیم کے بعد
پاکستان کے جارحانہ رویے کی ہیبت اس طرح دلوں پر طاری تھی
کہ آئین ساز اسمبلی نے اتفاقِ رائے سے ہندی کو ملک کی
سرکاری زبان تسلیم کرلیا۔"

یہی اندازِ فکر تقسیم ہند کی صورت میں سامنے آیا۔ جب تک ہندوستان میں اس فکر کے حامل دانشور موجود ہیں۔ ہندوستان تقسیم ہوتا رہے گا۔ ہندوستان پہلی بار تقسیم نہیں ہوا۔ اس کی ختم نہ ہونے والی نفرت اور بڑھتا ہوا تعصب اسے بار بار تقسیم کرے گا اور تقسیم کا یہ عمل صدیوں تک چلے گا۔
جب ہندو سیاستدانوں کی طرف سے اردو کی مخالفت کی گئی اور ہندی کو پورے

ہندوستان کی زبان قرار دیا گیا تو بات بگڑتی چلی گئی اور دوسرا رُخ اختیار کر گئی۔ ہندوستان کے مسلمان اردو کو اپنی زبان تصور کرنے لگے ایک غلط فہمی نے حقیقت کا روپ دھار لیا اور پھر کوئی زبان ہندوستان کی مشترکہ زبان نہ رہی۔ ایک زبان ہندوؤں کی ہو گئی اور ایک مسلمانوں کی بعد ازاں ملک کی تقسیم ناگزیر ہو گئی۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اردو کا مطالعہ مسلمانوں کے حوالے سے کیا ہے۔ یہی ایک بنیادی غلطی ہے جو کہ ڈاکٹر گیان چند اور ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے سے سرزد ہوئی۔ اردو کا مقدمہ ہندوستان کے مشترکہ ورثے کا مقدمہ تھا۔ جسے ہم نے تقسیم کا مقدمہ بنا لیا۔ اگر آپ تاریخی حقائق کا سرسری مطالعہ بھی کریں تو آپ دیکھیں گے کہ کانگریس مسلسل مسلمانوں کو تقسیم ہند کی طرف دھکیل رہی ہے۔ ایسے حالات پیدا کیے جا رہے ہیں کہ مسلمان بار بار ایک الگ وطن کی ضرورت کو محسوس کریں۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی کتاب ''ہندی اردو تنازع'' سے چند اقتباسات پیش کرتا ہوں۔ یہ اقتباسات خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ ان پر آگے بات ہو گی۔

''سچ یہ ہے کہ اردو تنازع میں اردو کی اہمیت اور قومی زبان کی حیثیت سے اس کو اپنا لینے کا احساس مسلمانوں میں اوّل اوّل مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاسوں کی معرفت میں پیدا ہوا۔ صرف یوپی، دہلی یا بہار کے مسلمانوں میں نہیں، برصغیر کے ہر صوبے کے مسلمانوں نے جداگانہ قومیت کے ساتھ ساتھ ایک قومی زبان کی ضرورت محسوس کی، ہندی کے حامیوں اور اردو کے خلاف حکومت کے رویوں نے خاص طور پر انہیں چونکا دیا۔ چنانچہ فارسی کے ختم ہو جانے کے بعد ان کی توجہ اردو پر مرکوز ہو گئی۔ اردو ایک ترقی یافتہ زبان تھی فارسی رسم خط میں لکھی جاتی تھی، برصغیر کے مسلمانوں کی تہذیبی زندگی اور ثقافتی ورثے کی ترجمان تھی اور باہم تبادلۂ خیال کے وسیلہ ہونے کے سبب سب میں مقبول تھی۔ اس لیے ہر صوبے کے مسلمانوں نے اردو کو باہمی افہام و تفہیم کی غرض سے اپنا لینے اور پورے برصغیر کی مشترکہ زبان (لینگوا فرینکا) منوانے پر زور دیا۔''

''انجمن ترقی اردو کی الگ حیثیت قائم ہو جانے اور مسلم لیگ کے وجود میں آنے کے بعد یہ ضرور ہوا کہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی زیادہ توجہ اپنے اصل کام یعنی مسلمانوں میں تعلیمی ترقی کی طرف مبذول رہی، لیکن چونکہ کانفرنس کے بنیادی کاموں میں تعلیم کی ہر سطح پر اور ہر جگہ اردو کو ترقی دینے اس کو ذریعہ تدریس بنانے اور اس کے علمی و ادبی معیار کو بلند کرنے کی ذمہ داریاں بھی

شامل تھیں۔ اس لیے کانفرنس کا کوئی عمل اور کوئی اقدام اردو کے دفاع اور اشاعت کی کوششوں سے خالی نہ تھا۔ البتہ اردو کی لسانی اور تاریخی حیثیتوں کو متعین کرنے، اس کے علمی و ادبی ذخیرے میں تیزی سے اضافہ کرنے، سیاسی نوعیت کی تحریکات و اصلاحات میں اردو کو جائز مقام دلوانے اور اسے اس کے دشمنوں سے بچانے، نیز عوامی سطح پر ہندی اردو تنازع میں اردو کی وکالت و پیروی کرنے کی بھاری ذمہ داریاں انجمنِ ترقی اردو کو سونپی گئیں۔ جنہیں مولوی عبدالحق نے ۱۹۱۲ء کے بعد بدرجہ اَتم پورا کیا۔ سرسید احمد خان کی طرح مولوی عبدالحق بھی اردو کے لیے عمر بھر لڑتے رہے یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ اردو ہندی کا جو قضیہ، سرسید کے زمانے میں اُٹھا تھا اور اس کی ابتدائی منزلوں میں سرسید نے جس سرگرمی سے حصہ لی تھا۔ مولوی عبدالحق نے اسی سرگرمی سے اس قضیے کے آخری مرحلوں میں حصہ لیا اور جس مشن کو سرسید نے شروع کیا تھا، اسے مولوی صاحب نے تکمیل کو پہنچایا۔

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، اور انجمنِ ترقی اردو کے ساتھ ساتھ خالص سیاسی سطح پر، اردو کے مقدمے کی پیروری مسلم لیگ نے اپنے ذمے لی۔ ۱۹۰۶ء میں جن لوگوں نے مسلم لیگ کی بنا ڈالی تھی اور جو لوگ اس کے پہلے اجلاس میں شریک ہوئے اور شروع شروع میں بڑے ذوق و شوق سے اس کے رکن بنے، ان میں بیشتر وہ تھے جو مسلم لیگ کے قیام سے پہلے بھی اردو کی حمایت میں پیش پیش رہ چکے تھے اور جنہوں نے اردو کے خلاف ہندو اور انگریز کی متحدہ کوششوں کا مقابلہ کیا تھا۔ بعدازاں جب ملک گیر پیمانے پر مسلم لیگ کی تنظیم کی گئی اور اس کی شاخیں مختلف صوبوں اور ضلعوں میں قائم کی گئیں تو ان ضلعی اور صوبائی مسلم لیگ کمیٹیوں کے اوّلین ارکان میں بہت سے وہی یا ان کے خاندان کو وہ لوگ تھے جو ۱۸۷۳ء میں اردو ڈفینس ایسوسی ایشن، الٰہ آباد اور ۱۹۰۰ء میں اردو ڈفینس ایسوسی ایشن، لکھنؤ میں سرگرم حصہ لے چکے تھے۔''

○○○

''وہ دو قومی نظریہ، جس کا ذکر پہلے پہل سرسید نے ہندی اردو تنازع کے سلسلے میں کیا تھا اور جسے مسلمان اپنی سیاسی حکمت عملی کا بنیادی اصول بنائے ہوئے تھے۔ ہندو مسلم سیاست کی بساط پر کھلی اور ٹھوس حقیقت کی شکل میں سے سامنے آ گیا۔''

''ہندی، اردو تنازع'' (ہندو مسلم سیاست کی روشنی میں)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی تحقیق سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ سرسید احمد خان وہ پہلے ہندوستانی

تھے جنہوں نے مسلمانوں کو یہ احساس دلایا کہ اردو ان کی زبان ہے۔ یہاں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ سرسید نے ایسا کیوں کیا؟ جبکہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان نہ تھی۔ اسے آپ سرسید کی سادگی بھی کہہ سکتے ہیں اور انگریز کی سازش بھی، کیونکہ سب سے پہلے انگریز سرکار نے ہی یہ تصور دیا کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے اور ہندی ہندوؤں کی، ورنہ اس پہلے یہ تصور ہندوستان اور ہندوستانیوں میں موجود نہ تھا۔ انگریزی حکمتِ عملی سے پہلی بار زبانوں کو مذہب اور دھرم مل گیا۔ اور زبان کی تقسیم کے عمل میں تیزی آ گئی۔

انگریز سرکار نے زبان کے قدرتی ارتقائی عمل کو روک دیا اور اس میں مداخلت شروع کر دی جو بعد ازاں ہندو مسلم تضاد کی شکل میں سامنے آتی ہے۔ یہ تضاد فکری، نسلی اور مذہبی صورتوں میں اظہار کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

زبان کی تقسیم کے تصور کو پختگی عطا کرنے کے لیے ہندی اور اردو کے نامور عالم منظرِ عام پر آئے۔ ایک زبان میں سنسکرت کے الفاظ بڑھتے چلے گئے اور دوسری طرف عربی اور فارسی کو عزت ملتی گئی۔ ایک زبان دو حصوں میں تقسیم ہوگی اور پھر دونوں حصوں کی عظمت الگ الگ بیان ہونے لگی۔ دانشوروں کے دو ڈھڑے بن گئے اور دونوں طرف کے دانشور ہندی اور اردو کے گیت گانے لگے اور ایک دوسرے کی زبان کو برا بھلا کہنے میں مہارت حاصل کر لی۔

یہ تو ایسے ہی ہے کہ آدھا تاج محل مسلمانوں کو مل جائے اور آدھا ہندوؤں کو ــــــ مسلمان کہنا شروع کر دیں کہ ہمارا تاج محل عظیم ہے اور ہندو کہیں ہمارا تاج محل زیادہ عظمت کا حامل ہے اور دونوں یہ بھول جائیں کہ تاج محل مسلمانوں اور ہندوؤں کا مشترکہ کارنامہ ہے۔ اس شاہکار کی تعمیر میں دونوں نے ایک سی محنت کی ہے یہ ہندوستانیوں کے سادگی ہے کہ انہوں نے انگریز سے آزادی حاصل کی اور اسے دوست بھی سمجھ لیا۔

رشید احمد صدیقی نے ۱۹۲۶ء میں ''سہیل'' کے نام سے ایک ادبی رسالہ جاری کیا۔ اسکے پہلے شمارے میں ایک شذرہ ''اردو اور ہمارا عقیدہ'' کے عنوان سے شامل ہے۔ علی گڑھ اور رشید احمد صدیقی کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے باوجود صدیقی صاحب نے اردو کے بارے میں بہتر رائے قائم کی۔

''اردو اور ہمارا عقیدہ'' میں لکھتے ہیں:

''بحیثیت مسلمان ہونے کے ہم اپنے مستقبل کو ہمیشہ جرأت اور اُمید کے ساتھ دیکھنے

کے خوگر ہیں۔ اس لیے مجھے یہ کہنے میں باک نہیں ہے کہ باوجود اس کے کہ اس وقت اردو کی فضا تاریک ہو رہی ہے۔ اور دوسری زبانوں کا مطلع نسبتاً زیادہ روشن نظر آ رہا ہے۔ اردو کا مستقبل تاریک نہیں ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ اردو میں ترقی کی کافی استعداد ہے اور ہندوستان کی دو زبردست متمدن قوموں کا یہ ایک ادبی مفاہمہ ہے۔ اس لیے اس کا مستقبل کبھی یاس انگیز نہیں ہو سکتا۔ ضرورت صرف اس کی ہے کہ ہم اپنی استعداد اور اپنے مہتم بالشان نصب العین کے منکر نہ ہوں۔ ہم کو اردو کی حمایت میں ہندی یا کسی دوسری زبان کا مخالف نہ بننا چاہیے۔ یہ کس قدر صریح حقیقت ہے کہ اگر ہم ایک چیز کے شیدائی ہیں تو دوسروں کو دوسری چیز پر مفتون ہونے کا حق حاصل ہے۔ اگر ہندو اور مسلمان یا دوسری قومیں ہندوستان کے صلح جو اور عافیت پسند شہری بن سکتے ہیں اور اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے، تو پھر کیا وجہ اردو، ہندی یا دوسری زبانیں اپنی اپنی جگہ پر ترقی کر کے ایک ہی بلند اور مساوی سطح پر نہ آ سکیں۔ اگر ایسا نہ ہو سکے تو پھر یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ہمارے نصب العین، ہمارے زاویۂ نگاہ اور طریق کار میں نقص ہے۔ اختلافات کہاں نہیں ہوتے، اختلافات نہ ہوں تو زندگی کی حیثیت تعطل محض کی رہ جاتی ہے اور یہ موت یا نیستی کا دوسرا نام ہے۔ ہاں ضرورت اس امر کی ہے کہ ہمارے اختلاف ایمان داری اور خلوص پر مبنی ہوں، دنیا اس حقیقت کو محسوس کر چکی ہے کہ ہر عمل خود اپنی مکافات ہے، اس لیے دوسروں کو زک پہنچائیے، ہم کو اپنے خلوص اور لامتناہی استعداد پر بھروسا رکھنا چاہیے۔ دنیا کی کش مکش سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ہر فرد میں بے پناہ قوتیں ودیعت کی گئی ہیں، اگر وہ ان سے فائدہ اُٹھانا نہیں چاہتا یا ان کو غلط مصرف میں لانا چاہتا ہے۔ ہم اردو کو ہر وقت اور ہر مخالفت کے مقابلہ میں کامیاب رکھ سکتے ہیں، ضرورت اس کی ہے کہ ہم جیسا نصب العین مقرر کریں۔ اس کے مطابق جفاکشی اور جفا طلبی کے بھی خوگر ہوں۔ صرف اخباروں میں مضامین لکھنے، تجاویز پاس کرنے، پلیٹ فارم پر دادِ فصاحت دینے یا رسالوں اور صحیفوں کے شائع کرنے سے کام نہیں چل سکتا۔ اگر کام کرنا ہے تو پھر چاہیے کہ ہم جو کہیں یا کریں اس پر عقیدہ رکھتے ہوں اور عقیدہ رکھنے کے یہ معنی ہیں کہ دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت بھی ہم کو کسی وقت اور کسی طور پست خیال یا پست ہمت نہ بنا سکے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہم تمام دنیا کو ہمیشہ کے لیے دھوکا دے سکتے ہیں۔ اور اکثر ہم اپنی ذاتی منفعت کے لیے آسمان و زمین ایک کر دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہماری فریب کی کامیابی ہمارے مقصد مہمہ کی کامیابی ہے، لیکن یہی وہ چیز ہے جس کے متعلق ہماری سب سے بڑی کتاب ''خسران مبین'' کا

لفظ فرمایا گیا ہے۔‘‘ (۲)

یہ رشید احمد صدیقی کی رائے ہے۔ جسے آج زمانہ گزرنے کے بعد بھی غور سے پڑھا جا سکتا ہے۔ مگر ان دنوں اس رائے کو یقیناً اہمیت نہیں دی گئی ہو گی۔ کیونکہ ان دنوں اردو اور ہندی کے بڑے بڑے شہ زور میدانوں میں اُترے ہوئے تھے اور اپنے اپنے موقف پر ڈٹے ہوئے تھے یہی ان کے نزدیک عقیدے کی سچائی تھی کوئی درمیانی راستہ اُنہیں قبول نہیں تھا وہ رشید احمد صدیقی کی شگفتہ بیانی کو خاطر میں کیا لاتے۔ یہ ان کی نظریاتی مجبوری تھی۔

ہندی کے لسانیاتی مفکروں اور بنیاد پرست نے تو سر تیج بہادر سپرو کو نظر انداز کر دیا جو کہ ہندوستان کی ایک قابلِ احترام شخصیت تھے۔ ڈاکٹر سپرو نے ۲۶ ر دسمبر ۱۹۲۸ء کے لیڈر اخبار میں لکھا:

’’میں ہرگز یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ جس زبان کو دہلی اور لکھنؤ کے اساتذہ نے دو ڈھائی سو برس میں مانجھ کر اس مرتبے پر پہنچایا ہے۔ اس کو اس طرح برباد کیا جائے۔ اردو کو میں مسلمانوں کی زبان نہیں سمجھتا، یہ ہندو اور مسلمانوں کی مشترک زبان ہے۔ اس کی پیدائش ونشو ونما میں دونوں نے یکساں حصہ لیا ہے یہ ہرگز تقسیم نہیں ہو سکتی۔ یہ وہ زبان ہے جس نے سترہویں اٹھارویں اور انیسویں صدی میں ہندو مسلمانوں میں ایک دوسرے کے خیالات اور مذاق کو سمجھنے کی قابلیت پیدا کی۔ اگر اردو پر یہ اعتراض ہے کہ بعض الفاظ دیہاتیوں کی سمجھ سے باہر ہیں تو ہندی میں اور خصوصاً اس ہندی میں جو آج بولی جاتی ہے صدہا الفاظ ہیں جو اچھے شہری بھی نہیں سمجھ سکتے۔‘‘ (۳)

انجمن ترقی اردو کے صدر کی حیثیت سے ڈاکٹر ذاکر حسین نے اس موقع پر جو خطبہ دیا اس میں انہوں نے کہا:

’’کیا ستم ہے کہ اردو پر اور اردو کے حامیوں پر کوئی فرقہ پرستی کا الزام لگائے۔ اردو کسی فرقے کی زبان نہیں ہے۔ کسی مذہب کی زبان نہیں ہے، کسی حکومت کی چلائی ہوئی زبان نہیں ہے۔ یہ تو میل جول کا پھل ہے۔ جنتا کی زبان ہے۔ یہ وسعت قلب کی زبان ہے، رواداری کی زبان ہے۔ محبت اور پریم کی زبان ہے اس ملک کے بسنے والوں کے رابطہ دلی اور رابطہ ذہنی کا نتیجہ ہے اور ان بسنے والوں میں ہندو مسلم، سکھ، عیسائی کا کوئی امتیاز نہیں۔‘‘ (۴)

زبان کو تقسیم کرنے والے بنیاد پرست کہہ رہے تھے کہ ’’ہائے ہندوستان کیوں تقسیم ہو گیا؟ یہ دھرتی ماتا کے ٹکڑے کیوں کر رہے ہو؟‘‘ ___ ہندوستان کی تقسیم اگر کسی کو سمجھ نہ آئے تو وہ اردو ہندی تنازع کی تاریخ پڑھ لے۔ خواہ یہ کسی ہندو کی لکھی ہو یا کسی مسلمان کی، یہ بات دونوں

طرف سے آپ آسانی سے سمجھ لیں گے ہندوستان کی تقسیم کب اور کہاں سے شروع ہوئی۔

ایک زبان کو تقسیم کر کے اس کے دو حصوں کو الگ الگ مذہب دیا۔ ایک حصہ ہندو ہو گیا اور دوسرا مسلمان، رواداری کو ترک کر دیا گیا۔ محبت اور پریم کا خاتمہ ہوا۔ ایک ملک میں بسنے والوں میں دلی اور ذہنی رابطہ جانبداری کی نذر ہو گیا۔

برسوں کے تعلق کو جدید تعلیم یافتہ قیادت نے نیست و نابود کر دیا اور وطن سے محبت کے معنی بدل گئے۔ یہ سب کچھ شعوری طور پر کیا گیا۔ ہندوستان کے جدید سیاسی شعور نے ایک نہ ختم ہونے والے تضاد اور فساد کو جنم دیا۔ ۵۶ برس اسی گتھی کو سلجھانے میں گزر گئے اتنے ہی برس اور گزر جائیں گے ہم اس کا کوئی حل تلاش کرنے میں کامیاب نہیں ہوں گے۔ ایک صدی رائیگاں گزر جائے گی اور ایک صدی کی تاریخ میں حیثیت ہی کیا ہے؟

○○○

(۲)

اردو ہندی قضیے کو سمجھنے کے لیے ''نقوش سلیمانی'' (۵) کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ سید سلیمان ندوی ایک غیر جانبدار اور اعتدال پسند محقق اور نقاد تھے۔ ان کی رائے کو سامنے رکھیں تو اردو ہندی کے تاریخی پہلو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

خطبۂ صدارت اجلاس شعبۂ ترقی اردو آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس (منعقدہ پونا بتاریخ ۲۹/دسمبر ۱۹۱۵ء) سے چند اقتباسات پیش کرتا ہوں۔

''ہندوستان کسی زمانہ میں بھی ایک نہ تھا اور مستقل ملک نظر نہیں آتا۔ یہاں کا ہر صوبہ ایک نئی راجدہانی، ایک نئی زبان، ایک الگ تمدن یعنی ایک نیا ملک تھا۔ جو اپنے لیے مخصوص خصوصیات رکھتا تھا سنسکرت زبان یہاں کی مشترک مقدس زبان ضرور نظر آتی ہے، لیکن تاریخ سے یہ ثابت نہیں کہ یہ کسی زمانہ میں ہندوستان کی مشترک گفتگو کی زبان تھی۔ ہندوستان کا میدان داخلی اقوام کے علاوہ خارجی حملہ آور قوموں کا بھی ہمیشہ جولانگاہ رہا ہے۔ ستیھین یعنی ایک تورانی النسل شاخ، پھر آرین، پھر یونانی، پھر عرب، ترک، پٹھان، مغل اقوام یکے بعد دیگرے ہندوستان میں داخل ہوئے۔ سولہویں صدی میں اہلِ یورپ کا یہاں کے سواحل پر گزر ہوا جن میں سب سے پیشرو پرتگالی اور ان کے بعد فرنچ اور سب سے آخر میں انگریز تھے۔ ایک ایسا ملک جو مختلف نسلوں،

مختلف قوموں، مختلف زبانوں کا مجموعہ تھا، ناگزیر ہے کہ وہاں باہمی میل جول کے بعد ایک زبان پیدا ہو۔ وہ پیدا ہوئی اور اسی کا نام اردو ہے۔" (ص ۵)

○○○

"اردو زبان کسی قوم کی زبان نہیں ہے اس میں ہندی، اسلامی، یورپین تمام زبانوں کا ذخیرہ ہے اور اس کی ملکیت کا باشندگانِ ہند بجا طور پر دعویٰ کر سکتے ہیں اور اس کو مسلمانوں کے ساتھ کوئی خاص خصوصیت نہیں بلکہ ہندوستان کی مشترک زبان ہے۔"

"ہندوستان میں تقریباً سو بولیاں اور زبانیں ہیں۔ جو پہاڑیوں اور صحراؤں کے چھوٹے چھوٹے آوارہ گرد قبائل سے لے کر بڑی بڑی قوموں پر محیط ہیں۔ اگر ہندوستان ایک ملک بننا چاہتا ہے اور اس کے قومی تعلیمی اور سیاسی خیالات کو بحیثیت ایک قوم اور ایک ملک کے ترقی کرنا ہے تو ایک مشترک زبان کے بغیر چارہ نہیں۔"

"اردو زبان کا پیدا ہونا کسی ایک قوم یا قوت کا نہیں بلکہ مختلف قوموں اور زبانوں کے میل جول کا ایک ناگزیر نتیجہ ہے اور اس کا پیدا ہونا ضرورۃً اور مجبوراً تھا مسلمان عربی اور فارسی لے کر ہندوستان آئے اس پر دو سو برس بھی گزرنے نہ پائے تھے کہ ایک مشترک زبان پیدا ہو گئی۔ اردو شاہجہان کے عہد کی یادگار بتائی جاتی ہے، لیکن اصل یہ ہے کہ غوریوں، خلجیوں اور تغلقوں ہی کے زمانہ میں یہ پیدا ہو چکی تھی۔" (ص ۶)

○○○

"اردو زبان چونکہ قومی نہیں بلکہ ملکی زبان ہے۔ اس لیے اس کی تحریری ترقی واشاعت میں ہندو اور مسلمان دونوں قوموں کا برابر حصہ رہا ہے۔ تاہم انیسویں صدی کے اختتام پر بعض نافہم حکام کی بدولت اردو اور ہندی کا ناگوار قضیہ پیدا ہوا اور اسی کے لیے ۱۹۰۳ء میں انجمن ترقی اردو کی بنیاد ڈالی گئی کہ زبان اردو کے حقوق کی حفاظت ہو سکے۔ اردو زبان ہندوستان کے ہر صوبہ میں ایک حریف مقابل سمجھی جاتی ہے۔" (ص ۱۰)

علامہ سید سلیمان ندوی کی تحقیق سے ایک ہی بات سامنے آتی ہے کہ اردو ہندوستان کی ایک مشترک زبان ہے جس کی وجہ سے پورے ہندوستان کا رابطہ قائم ہے۔ وہ اردو ہندی قضیے کا ذمہ دار اس دور کے نافہم حکام کو ٹھہراتے ہیں جبکہ یہ حکام کی نافہمی نہیں، سازش تھی۔ یہ انگریز کی سازش تھی جس کا شکار ہندو، مسلمان دونوں ہی ہوئے۔ وہ ایک مشترک زبان کا الگ الگ مذہب

قائم کرنے لگے۔ زبان کے ساتھ دین اور دھرم کی بات ہونے لگی۔

اب میں سید صاحب کے ایک مقالے کی طرف آتا ہوں۔ یہ مقالہ ''ہندوستان میں ہندوستانی'' کے عنوان سے انجمن اردوئے معلّٰی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ۱۹۳۳ء کو پڑھا گیا۔

''ہندی لفظ'' کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

''آج کل جس کو ''ہندی'' کہتے ہیں، وہ پورب کی ایک صوبہ داری بولی ہے، جس کے لیے یہ کوشش کی جاری ہے کہ یہ پورے ملک کی بولی ہو جائے مگر حقیقت میں اس کا ایسا نام جس کی معنویت کے دائرہ میں سارا ہندوستان داخل ہو جائے۔ خود بدیسی ہے پھر بھی اس کے لیے ایسا نام اختیار کرنا اس لیے مناسب ہے کہ اس سے سارے ملک ہند کا خیال سامنے آتا ہے ورنہ اگر اس کو برج بھاشا یا پوربی بھاشا کہہ دیا جائے تو یہ ملک کے ایک محدود جغرافی حصہ کے ساتھ خاص ہو جائے۔

اہلِ عرب یہاں کی قدیم زبانوں میں سے ہر ایک کو ''ہندی'' یا ''ہندیہ'' کہتے تھے وہ سنسکرت، پالی، سندھی، ملتانی، گجراتی سب کو ہندی ہی کہتے تھے۔'' (ص ۵۹)

''اردو اور ہندی کی تقسیم'' کے بارے میں سید صاحب لکھتے ہیں:

''انگریزوں نے دہلی کے اردوئے معلّٰی کو اُجاڑ کر کلکتہ کی فورٹ ولیم میں اپنا نیا ''اردوئے معلّٰی'' بنا کر کھڑا کیا۔ تو ان کو اپنے ہم قوم عہدہ داروں اور تعلیمی اداروں کی خاطر ملکی زبان کی طرف بھی توجہ کرنی پڑی مگر ساتھ ہی ساتھ ان کو یہ بھی معلوم تھا کہ ان کو ہندوستان میں حکومت کرنا ہے تو اس متحدہ قومیت کے درخت پر جو صدیوں کی خونریزی سے سینچ سینچ کر تیموریوں کی باغبانی سے تیار ہوا تھا، پہلے کلہاڑی مارنا ضروری ہے اس کے لیے ضرورت تھی کہ ہندو اور مسلمانوں کے امتیازات کے حدود کو جس قدر ممکن ہو۔ ابھارا جائے، چنانچہ فورٹ ولیم میں اردو ہندی کے نام سے دو شعبے قائم ہوئے، ایک کو مسلمانوں کے سر پر تھوپا اور دوسرے کو ہندوؤں کے سر مڑھا اور اس کا نام علمی قدردانی اور ادب نوازی رکھا اور دونوں زبانوں میں کتابیں لکھوا لکھوا کر لوگوں میں تقسیم کی گئیں۔ یہ ہے آغاز اس انجام کا جو آج اردو اور ہندی کے مہابھارت کی صورت میں ملک میں قائم ہے۔

شاید آج لوگوں کو وہ واقعہ بھی یاد نہ ہو جس کا تعلق عظیم الشان درس گاہ کے پہلے بانی سے ہے، ہندی اردو کا جھگڑا ۱۸۶۷ء سے شروع ہوا ہے۔ اسی سال بنارس میں بعض سربرآوردہ ہندوؤں نے یہ کوشش شروع کی کہ تمام سرکاری عدالتوں میں سے اردو زبان اور فارسی موقوف ہو کر

قائم کرنے لگے۔ زبان کے ساتھ دین اور دھرم کی بات ہونے لگی۔

اب میں سید صاحب کے ایک مقالے کی طرف آتا ہوں۔ یہ مقالہ ''ہندوستان میں ہندوستانی'' کے عنوان سے انجمن اردوئے معلیٰ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ۱۹۳۳ء کو پڑھا گیا۔

''ہندی لفظ'' کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

''آج کل جس کو 'ہندی' کہتے ہیں، وہ پورب کی ایک صوبہ داری بولی ہے، جس کے لیے یہ کوشش کی جاری ہے کہ یہ پورے ملک کی بولی ہو جائے مگر حقیقت میں اس کا ایسا نام جس کی معنویت کے دائرہ میں سارا ہندوستان داخل ہو جائے۔ خود بدیسی ہے پھر بھی اس کے لیے ایسا نام اختیار کرنا اس لیے مناسب ہے کہ اس سے سارے ملک ہند کا خیال سامنے آتا ہے ورنہ اگر اس کو برج بھاشا یا پوربی بھاشا کہہ دیا جائے تو یہ ملک کے ایک محدود جغرافی حصہ کے ساتھ خاص ہو جائے۔

اہلِ عرب یہاں کی قدیم زبانوں میں سے ہر ایک کو 'ہندی' یا 'ہندیہ' کہتے تھے وہ سنسکرت، پالی، سندھی، ملتانی، گجراتی سب کو ہندی ہی کہتے تھے۔'' (ص ۵۹)

''اردو اور ہندی کی تقسیم'' کے بارے میں سید صاحب لکھتے ہیں:

''انگریزوں نے دہلی کے اردوئے معلیٰ کو اُجاڑ کر کلکتہ کی فورٹ ولیم میں اپنا نیا ''اردوئے معلیٰ'' بنا کر کھڑا کیا۔ تو ان کو اپنے ہم قوم عہدہ داروں اور تعلیمی اداروں کی خاطر ملکی زبان کی طرف بھی توجہ کرنی پڑی مگر ساتھ ہی ساتھ ان کو یہ بھی معلوم تھا کہ ان کو ہندوستان میں حکومت کرنا ہے تو اس متحدہ قومیت کے درخت پر جو صدیوں کی خونریزی سے سینچ سینچ کر تیموریوں کی باغبانی سے تیار ہوا تھا، پہلے کلہاڑی مارنا ضروری ہے اس کے لیے ضرورت تھی کہ ہندو اور مسلمانوں کے امتیازات کے حدود کو جس قدر ممکن ہو۔ ابھارا جائے، چنانچہ فورٹ وَلیم میں اردو ہندی کے نام سے دو شعبے قائم ہوئے، ایک کو مسلمانوں کے سر پر تھوپا اور دوسرے کو ہندوؤں کے سر مڑھا اور اس کا نام علمی قدردانی اور ادب نوازی رکھا اور دونوں زبانوں میں کتابیں لکھوا لکھوا کر لوگوں میں تقسیم کی گئیں۔ یہ ہے آغاز اس انجام کا جو آج اردو اور ہندی کے مہابھارت کی صورت میں ملک میں قائم ہے۔

شاید آج لوگوں کو وہ واقعہ بھی یاد نہ ہو جس کا تعلق عظیم الشان درس گاہ کے پہلے بانی سے ہے، ہندی اردو کا جھگڑا ۱۸۶۷ء سے شروع ہوا ہے۔ اسی سال بنارس میں بعض سر برآوردہ ہندوؤں نے یہ کوشش شروع کی کہ تمام سرکاری عدالتوں میں سے اردو زبان اور فارسی موقوف ہو کر

ہندی بھاشا اور دیوناگری خط جاری ہو۔ سرسید اس وقت سے لے کر مرنے سے نو دن پہلے تک اس کے خلاف قلمی جہاد میں مصروف رہے اور انہی کی مخالفت کا اثر تھا کہ ان کی زندگی تک یہ تجویز سرکاری طور سے منظور نہ ہو سکی، ان کی وفات کے چند سال بعد، غالباً ۱۹۰۲ء میں سرمیگڈانل صاحب لیفٹیننٹ گورنر صوبہ متحدہ نے اس صوبہ میں ہندی کو قانوناً ممتاز حیثیت بخشی اور اردو ہندی کی ناگوار بحث کا وہ تخم اس سرزمین پر بویا، جس کو اس سے پہلے وہ بہار میں بو چکے تھے، لکھنؤ کے گنگا پرشاد ورما لائبریری ہال میں سرسید کے جانشین اور اس درس گاہ کے سیکرٹری نواب محسن الملک مرحوم کی صدارت میں اردو کے ماتم کے لیے ایک جلسہ منعقد ہوا، جس میں مرحوم نے ایک دلگداز موثر تقریر کے بعد اردو کے لیے یہ مصرع پڑھا تھا ع

عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

اور یہی وہ فضا ہے جس میں انجمن ترقی اردو کی بنیاد پڑی اور ہندی بھی پنڈت مالوی کی کوششوں کی زیرِ پرستی روز بروز ترقی پانے لگی، ہندی اخبار اور رسائل اور تصنیفات کا انتظام ہوا اور پورے ملک میں اردو اور ہندی دو حریف کی حیثیت سے صف آراء ہوئیں اور اب تک ہیں اور اب انہوں نے ہندو مسلمان دونوں کی دو الگ الگ زبانوں کی شکل اختیار کر لی ہے جو حد درجہ افسوسناک ہے۔" (ص ۶۰، ۶۱)

سید صاحب کی مندرجہ بالا عبارتیں اردو ہندی جھگڑے کے حوالے سے بہت کچھ واضح کرتی ہیں۔ یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستان کی تقسیم کی بات اس وقت شروع ہوئی جب ہندوؤں کی طرف سے اردو کے ساتھ ناانصافی ہوئی، لیکن کانگریسی سیاست دانوں نے اس سے کوئی سبق حاصل نہ کیا اور انہوں نے اقتدار میں آنے کے بعد ہندوستان میں اردو کا خاتمہ کر دیا۔

آج کل ایک بار پھر پاکستان اور ہندوستان کے بہتر تعلقات کی بات ہو رہی ہے، لیکن یہ کیسے ممکن ہے جو لوگ (بہتر تعلقات کی بات کرنے والے) اس وقت اقتدار میں ہیں انہوں نے بابری مسجد کو گرایا اور زیادہ عرصہ نہیں ہوا کہ گجرات میں مسلمانوں کا قتل عام ہوا۔

ان بہتر تعلقات کی خواہش کے ساتھ، ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ہندوستان کی حکومت مسلمانوں کے ساتھ کی گئی ناانصافیوں پر شرمندہ ہوتی اور پھر بہتر تعلقات کی طرف پیش رفت کرتی تو شاید کوئی نتیجہ سامنے آتا۔

میں ہندوستان کی حکومت سے ایک ہی سوال کروں گا کہ آپ لوگ پاکستان کے ساتھ

بہتر تعلقات چاہتے ہیں کیا آپ کے ان مسلمانوں کے ساتھ اچھے تعلقات ہیں جو ہندوستان میں رہتے ہیں؟

ہندوستان کی حکومتوں کو اپنے رویے تبدیل کرنے ہوں گے۔ اپنی بنیاد پرستی اور انتہا پسندی کو ترک کرنا ہوگا۔ ورنہ پاکستان کے ساتھ ان کے بہتر تعلقات کی گفتگو کو ایک طرف رکھیے۔ اور دیکھئے کہ ہندوستان کی اس عظیم سلطنت میں کیسی کیسی تبدیلیاں آتی ہیں۔ ہر قوم کو ہندوستان سے اپنا حصہ واپس لینا ہے۔

اردو کے بارے میں مجھے آخری بات یہ کہنی ہے کہ الیکٹرانک میڈیا نے ثابت کر دیا ہے کہ سنسکرتی ہندی کی جگہ بالآخر اردو نے فتح حاصل کی۔ وہ سنسکرتی ہندی، ہندوستان کے سیاست دانوں کی زبان ہو کر رہ گئی ہے عوام کی زبان آج بھی اردو ہے۔ یہی اردو دنیا میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ یہی وہ فیصلہ ہے جو زمانے نے دیا ہے۔ زمانے کو نہ شکست دی جا سکتی ہے نہ ہی اس کے فیصلے کو چیلنج کیا جا سکتا ہے۔

دونوں ممالک کے بہتر تعلقات میں اردو ہی کو رہنمائی کرنا ہوگی کیونکہ یہی زبان دونوں ممالک کے درمیان رابطہ بحال کرے گی۔

OOO

(۳)

''اردو ہندی ایک تاریخی جائزہ'' ___ یہ مضمون جنوری ۱۹۸۵ء کو ایک کتابچے کی صورت میں شائع ہوا تھا(۶)۔ اس کی اشاعت کے بعد میں نے جب بھی اسے دیکھا تو یہ محسوس کیا کہ بات بہت ادھوری ہے۔ میں اپنی بات کو واضح نہیں کر سکا۔ اس لیے کہ اس موضوع میں بہت زیادہ وسعت ہے اور میں نے جو موقف پیش کرنا چاہا ہے وہ سچائی کے باوجود بہت ادھورا ہے اور سچائی کا ادھورا پن اسے غیر موثر بنا دیتا ہے۔

میں نے اسے موضوع پر مطالعہ جاری رکھا اور اب کوشش کی ہے کہ سچائی کا ادھورا پن دور نہ سہی کم ضرور ہو جائے۔ آپ اس میں کہیں کہیں تلخی محسوس کریں گے۔ یہ تلخی اس موضوع کی اپنی ہے۔ جب اس موضوع کو بیان کیا جاتا ہے تو وہ ظاہر ہو جاتی ہے۔

اس کتاب کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور آخر میں ایک مضمون کو شامل کیا گیا ہے۔

پہلے حصے میں علامہ سید سلمان ندوی کی کتاب ''نقوش سلیمانی'' سے ان کی ایک تقریر جوانہوں نے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کے شعبۂ اردو میں ۲۹ مارچ ۱۹۳۷ء کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں کی۔

دوسری تحریر'' گاندھی جی کی ہندوستانی سبھا'' سید ہاشمی فرید آبادی کی کتاب '' پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ترقی اردو'' سے، تیسری تحریر'' اردو سے ہندی تک'' ڈاکٹر عبدالودود کی کتاب (کتاب کا نام بھی ''اردو سے ہندی تک'' ہے) اور ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی تحریر ان کی معروف کتاب ''ہندی اور تنازع'' سے حاصل کی گئی۔

یہ تحریریں تھوڑی دیر کے لیے آپ کو ماضی میں لے جائیں گی۔ آپ دیکھیں گے کہ اردو کے ساتھ ہندوستانی سیاست میں کیا ناانصافی ہوتی رہی ہے۔ ان تحریروں میں انہی ناانصافیوں کی ایک جھلک دکھائی دے گی۔

دوسرے حصے میں پہلا مضمون ڈاکٹر گیان چند کا ہے وہ گاندھی جی کے لسانی وچاروں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اس روشنی میں مہاتمائی سیاست کا وہ کھیل نظر آئے گا جو اردو کے ساتھ کھیلا گیا۔ دوسرے اور تیسرے مضمون ''ہندوستانی، ہندی اور اردو'' اور ''ہندوستان کی قومی زبان۔ ہندوستانی'' میں گاندھی جی اپنے وچاروں کا درشن دیتے ہیں اور ان وچاروں میں لسانیاتی سیاست کے عجیب وغریب نمونے نظر آئیں گے۔ گاندھی جی ماہرِ لسانیات تو تھے نہیں، وہ ایک خاص طرح کے سیاست دان تھے اس لیے انہوں نے اردو کے ساتھ بھی ایک خاص طرح کا انداز اختیار کیا۔

چوتھا مضمون مولف کی اپنی کوشش ہے جسے ۱۹۸۵ء میں کتابچے کی صورت میں پیش کیا گیا تھا۔ یہ مضمون ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۶ء تک کے ''ہماری زبان'' (۷) کے مطالعہ سے تالیف کیا گیا تھا۔ ۱۹۸۵ء میں جب یہ کتابچہ شائع ہوا تو ایک بزرگ نقاد نے مجھے اپنا تبصرہ ارسال کیا اور اس میں لکھا کہ یہ ''بے وقت کی راگنی'' ہے یہ بات مجھے ان دنوں اچھی نہیں لگی تھی اس لیے آج تک یاد ہے۔ میں اس ''بے وقت کی راگنی'' کو ایک بار پھر پیش کررہا ہوں کہ یہ ایک ایسی سچائی ہے کہ اسے بار بار دھرایا جائے تاکہ نئی نسل کو اس بات کا اندازہ ہو کہ سیاست میں صرف افراد ہی نہیں، زبانیں اور تہذیبیں بھی فائدہ یا نقصان اُٹھا سکتی ہیں۔

وہ لوگ جن کی سمجھ میں ہندوستان کی تقسیم نہیں آتی انہیں اردو ہندی قضیے کا مطالعہ ضرور

کرنا چاہیے ان پر پاکستان کے مطالبے کی سچائی اور مہاتمائی سیاست کی مہارت واضح ہو جائے گی۔

تیسرے حصے میں مسعود حسین خاں کی آٹھ مختصر تحریریں شامل کی گئی ہیں۔ ان تحریروں میں ان دنوں کی کتھا ہے جب اردو ہندوستان میں بے سہارا ہو کر رہ گئی تھی۔ انہوں نے مشکل اور تکلیف دہ موضوعات کو نہایت آسان، سادہ اور شگفتہ انداز میں بیان کیا ہے۔ مسعود حسین خان کی کتاب ''اردو کا المیہ'' ۱۹۷۳ء میں شائع ہوتی۔ اسے مرزا خلیل احمد بیگ نے مرتب کیا۔

مرزا صاحب اس کتاب کے ابتدائیے میں لکھتے ہیں:

''زیرِ نظر تصنیف پروفیسر مسعود حسین خاں صاحب کے اُن صحافتی مضامین کا مجموعہ ہے جو 'ہماری زبان' (علی گڑھ) کے اداریوں اور انشائیوں میں مختلف اوقات میں منظرِ عام پر آتے رہے ہیں۔ پروفیسر آل احمد سُرور صاحب کی عدم موجودگی میں محترم مسعود صاحب نے مختلف زمانوں میں انجمن ترقی اردو (ہند) کے جنرل سیکرٹری کے فرائض انجام دیئے اور 'ہماری زبان' کے ایڈیٹر کی حیثیت سے تقریباً نو ماہ تک اس کے اداریے قلم بند کیے۔''

اس کتاب میں آٹھ منتخب اداریے پیش کیے جا رہے ہیں۔

۱۔ مہاتماجی نے کیا سوچا تھا؟ ۲۔ ہندوستان پرچار سبھا ۳۔ اردو رسم خط
۴۔ اردو ہے جس کا نام ۵۔ اردو بنام ہندی
۶۔ ۱۹۷۱ء کی مردم شماری اور اردو ۷۔ دل اور دے ان کو
۸۔ اردو، علاقائی یا دوسری سرکاری زبان

آخر میں رام پرکاش کپور کا مضمون ''بھارت میں اردو کشی'' شامل کیا جا رہا ہے۔ یہ مضمون حقائق کو سامنے لاتا ہے اور قریب کے زمانے کا ہے میں نے اس کا مطالعہ اگست ۲۰۰۳ء کو ایک رسالے میں کیا۔ میرا خیال ہے کہ اس کی اشاعت سے پڑھنے والوں کو تازہ ترین واقعات اردو سے آگہی ہوگی۔

(۴)

اس مقدمے کے آخر میں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ ''اردو کا مستقبل کیا ہے؟'' سید سلیمان ندوی نے اردو کے مستقبل کو ہندوستان اور پاکستان میں ایک خاص زاویے سے دیکھا ہے۔

''بھارت میں اردو کا مستقبل'' کے عنوان سے لکھتے ہیں۔

''بھارت نے گوارد و سے سرکاری اور تعلیمی زبان کی حیثیت سے اپنا پیچھا چھڑا لیا ہے، لیکن کیا عوام کے بول چال اور ایک طبقہ کی ادبی (لٹریری) حیثیت سے بھی اس کی زندگی آئندہ باقی رہے گی یا نہیں، اس کے پہلے ٹکڑے کا جواب یہ ہے کہ جب تک ہندی کی عمومیت عوام میں اتنی مقبولیت اور وسعت نہ حاصل کرے کہ وہ عوام کی زبان بن جائے عوام کو اردو کی ضرورت باقی رہے گی اور یہ کام ایک دو دن کا نہیں، بلکہ صدیوں کا ہے، دوسرے ٹکڑے کا جواب یہ ہے کہ یہ اس طبقہ کی ہمت اور محنت پر موقوف ہے۔ تاہم چونکہ لڑکوں کی تعلیمی زبان سنسکرتی ہندی بنا دی گئی ہے۔ اس لیے ڈر ہے کہ رفتہ رفتہ اس زبان میں فارسی اور عربی عنصر کم ہوتا جائے گا اور ہندی اور سنسکرت کے الفاظ بڑھتے جائیں گے۔ اس لیے دو تین نسلوں کے بعد عجب نہیں کہ بھارتی اور پاکستانی اردو سے الگ ہو جائے، تاہم جب تک بھارت میں مختلف زبانیں موجود ہیں آسان اردو یا ہندوستانی کی شکل میں اردو کا وجود ضروری ہے وہ کسی کے مٹائے مٹ نہیں سکتی کیونکہ زبان نہ مٹائی جاتی ہے نہ بنائی جاتی ہے، وہ خود فطرت کے اُصولوں پر جیتی اور مرتی ہے۔'' (۸)

سید صاحب نے بھارت میں اردو کے مستقبل کے بارے میں جو رائے قائم کی ہے۔ وہ حرف بہ حرف درست ثابت ہوئی ہے۔ الیکٹرانک میڈیا نے تو یہ ثابت کر دیا کہ اردو کے سوا کوئی زبان ایسی نہیں جو پاکستان اور ہندوستان کے درمیان رابطے کا کام کرے۔ آج جو پروگرام ٹی وی پر مقبول ہو رہے وہ گاندھی جی کی سنسکرتی ہندی کے نہیں ہیں وہ صاف ستھری اردو ہے جس میں ہندی کے الفاظ بھی ہیں۔ قدرت نے ابھی اردو کو ہندوستان سے پورے طور پر دیس نکالا نہیں دیا۔ نئے زمانے نے اردو کے حق میں بہتر فیصلہ دیا ہے۔

یہ درست ہے کہ بھارتی اردو اور پاکستانی اردو میں کچھ فرق آ گیا ہے، لیکن جدید دور نے اس فاصلے کو کم کر دیا ہے۔ اب بھارتی اردو اور پاکستانی اردو بیک وقت سنائی دے رہی ہے۔ ایک دوسرے کا اثر قبول کرتے ہوئے ایک اردو کی طرف بڑھ رہی ہے۔ یہ اردو صرف اردو ہو گی، بھارتی یا پاکستانی نہیں ہو گی۔

اردو اب دو ملکوں کی زبان نہیں رہی اس کو بولنے والے پوری دنیا میں موجود ہیں۔ اب وہی زبان باقی رہے گی جو پوری دنیا میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اور وہ اردو جو گاندھی جی کے عقیدے اور فارمولے سے پوری طرح آزاد ہے۔

پاکستان میں اردو کے مستقبل کے بارے میں سید صاحب لکھتے ہیں:

''پاکستان نے گو اردو کو اپنی سرکاری زبان مان لیا ہے، لیکن چونکہ پاکستان کے حصہ میں وہ صوبے آئے ہیں جن میں سے ہر صوبہ کی اپنی ایک زبان بھی ہے اس لیے پاکستان کو اپنی سرکاری زبان کو تعلیمی زبان بنانے کے لیے بڑی محنت کی ضرورت ہے تاہم اسی لیے کہ پاکستان کے ہر صوبہ کی الگ الگ صوبہ دار زبان ہے۔ پورے پاکستان کے لیے ایک واحد متحدہ زبان کی ضرورت بالکل طبعی اور مسلم ہے اور اسی بناء پر پاکستان میں اردو کا مستقبل شاندار ہے اور اس کا پرچم پنجاب کے مضبوط ہاتھوں میں آتا نظر آتا ہے۔''(۹)

یہ درست ہے کہ پنجاب میں اردو کا مستقبل شاندار تھا۔ اور اب بھی دوسرے صوبوں کی نسبت پنجاب میں اردو میں زیادہ کام ہو رہا ہے۔ اس کے ساتھ پنجاب کی دو صوبائی زبانوں (پنجابی اور سرائیکی) کا شعور بڑھ رہا ہے۔ مگر تاحال اردو کی اہمیت میں کمی نہیں آئی۔

سندھ اور بنگال کے بارے میں سید صاحب لکھتے ہیں:

''اردو کے لیے سب سے مشکل مرحلہ سندھ اور بنگال تھا مگر ان مہاجرین کی بدولت اردو ان صوبوں کی گلی گلی میں پھیل گئی ہے۔''

ان مشکلات کا نتیجہ بہت خوفناک برآمد ہوا۔ سندھ میں لسانی فسادات ہوئے اور پھر ایم کیو ایم نے کراچی میں جنم لیا اور اب کراچی سندھ کا حصہ ہوتے ہوئے بھی سندھ سے الگ دکھائی دیتا ہے۔

بنگال کا واقعہ اس سے زیادہ خوفناک تھا۔ ''نقوشِ سلیمانی'' کی اشاعت کے چند سال بعد مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن گیا اور اُردو والوں کو بہت سخت سزا ملی۔

البتہ سید صاحب کی یہ بات درست ہے کہ

''کراچی پر تو پورا قبضہ اردو ہی کا ہے۔''

اب ایک سوال کیا جا سکتا ہے کہ اردو اور ہندی کا مستقبل کیا ہوگا؟

- ان زبانوں کو ماضی میں الگ الگ کر دیا گیا تھا۔ جبکہ یہ حقیقت میں ایک ہی زبان تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ دونوں زبانیں ایک مرکز کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ مستقبل میں یہ ایک ہی زبان کے روپ میں نظر آ رہی ہے۔ پاکستان کے لوگ اسے اردو اور بھارت والے اسے ہندی کہتے رہیں گے۔

اہم واقعہ یہ ہے کہ اردو اور ہندی والے دنیا سے رابطے کے لیے انگریزی کا سہارا لیتے

ہیں۔ انٹرنیشنل سطح پر دونوں ملکوں کی زبان انگریزی قرار پا چکی ہے اور اردو، ہندی کا قضیہ بھی کسی حد تک اپنے انجام کو پہنچ چکا ہے۔ البتہ ضرورت اس اَمر کی ہے کہ برصغیر پاک و ہند میں امن قائم کیا جائے۔ ماضی کے ہزاروں فسادات (نسلی، لسانی اور مذہبی) اور لاکھوں جانوں کے نذرانے کے بعد ہمیں اتنا سبق تو حاصل کر ہی لینا چاہیے کہ برصغیر میں امن قائم کرنے کے لیے، پاکستان اور ہندوستان میں بہتر تعلقات کے لیے، چالاکی نہیں، خلوص کی ضرورت ہے۔

ooo

حوالہ جات

۱۔ میں یہاں مسلم لیگ کے ابتدائی دور کا ذکر نہیں کر رہا جس نے سرسید کے زیرِ اثر اردو کی بات کی۔ بعد کے دور میں جب مسلم لیگ ایک مضبوط سیاسی جماعت کے طور پر سامنے آئی۔ اس وقت اس کے سامنے اردو کا مقدمہ نہیں تھا۔ مگر کانگریس نے آخری وقت تک ہندی کی سربلندی کے لیے کام کیا۔

۲۔ بحوالہ شذراتِ رشید احمد صدیقی۔ مرتبین م۔ ندیم (علیگ) لطیف الزماں خاں، ملتان ۳۱ مارچ ۲۰۰۳ء، ص ۱۷-۱۸۔

۳۔ بحوالہ ''ہندی اردو تنازع'' (ہندو مسلم سیاست کی روشنی میں) ڈاکٹر فرمان فتح پوری، طبع دوم، ۱۹۸۸ء، ص ۳۴-۳۵ (''اردو حقیقت کے آئینے میں'' کراچی ۱۹۶۹ء، ص ۴۷)

۴۔ بحوالہ ''ہندی اردو تنازع'' (ہندو مسلم سیاست کی روشنی میں) ڈاکٹر فرمان فتح پوری، طبع دوم، ۱۹۸۸ء، ص ۳۵-۳۶ (''یادوں کی دنیا'' دارالمصنفین، اعظم گڑھ ۱۹۶۷ء، ص ۱۲۸-۱۲۹)

۵۔ میرے مطالعہ میں ''نقوش سلیمانی'' از علامہ سید سلیمان ندوی کا جو نسخہ ہے۔ اسے ۱۹۶۷ء (دوسرا پاکستانی ایڈیشن) میں اردو اکیڈمی سندھ نے شائع کیا۔ اردو ہندی کے جھگڑے کو سمجھنے کے لیے ''نقوش سلیمانی'' کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔

۶۔ یہ مضمون کتابچے کی شکل میں شائع ہونے سے کچھ عرصہ پہلے بہاولپور کے ایک ادبی رسالے (سائبان) میں شائع ہوا تھا۔ رسالہ اس وقت سامنے نہیں ہے۔

۷۔ انجمن ترقی اردو (ہند) نے ۱۹۳۹ء کو دہلی سے پندرہ روزہ اخبار ''ہماری زبان'' جاری کیا تھا۔

۸۔ نقوشِ سلیمانی۔ از۔ علامہ سیّد سلیمان ندوی۔ مطبوعہ ۱۹۶۷ء۔

۹۔ نقوشِ سلیمانی۔ از۔ علامہ سیّد سلیمان ندوی۔ مطبوعہ ۱۹۶۷ء۔

پہلا حصّہ
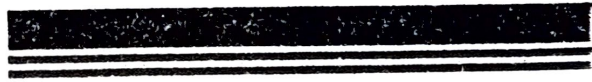
ہماری زبان کا نام

علامہ سید سلیمان ندوی

یہ تقریر آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے شعبۂ اردو میں ۲۹ مارچ ۱۹۳۷ء کی رات کو اسٹریچی ہال مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں کی گئی!

حضرات! قوموں اور زبانوں کی تاریخ ایک دن میں نہیں بنتی، ان کا خمیر اُٹھتے، مزاج بنتے اور ایک صورت پکڑتے صدیاں لگتی ہیں۔

آج ہم جس ملک کو آسانی سے ''ہندوستان'' کہہ دیتے ہیں، اور اس سے ہمالیہ کے دامن سے بحرِ شور کے ساحل تک کا علاقہ ہمارے ذہن میں آجاتا ہے، مسلمانوں کی آمد سے پہلے نہ یہ نام تھا اور نہ یہ اس کی وسعت تھی، اور نہ مسلمانوں سے پہلے اس ملک کا کوئی ایک ایسا نام تھا جو اس پورے ملک کو بتا سکے جو پنجاب کی سرحد سے شروع ہو کر بنگال، مدراس اور بمبئی کے کناروں پر جا کر ختم ہوتا ہے، بلکہ انتہا یہ ہے کہ اس پوری قوم کے لیے بھی جس نے آج اپنے کو ''ہندو'' کے نام سے ایک قوم بنالیا ہے کوئی ایک نام نہ تھا، کہتے ہیں کہ اس ملک کے ایرانی ہمسایوں کی زبان میں اس ملک کا نام سندھو تھا، اور قدیم ایرانی اور سنسکرت زبانوں میں ھ اور س کا باہم مبادلہ ہوجاتا ہے، اس طرح سندھو ہندو ہوا، اس ملک کے دوسرے بحری ہمسایہ کی زبان میں دو لفظ تھے، السند والہند، کشمیر کی ترائی سے لے کر موجودہ سندھ کے کناروں تک کو وہ سندھ، اور گجرات اور لاے باقی اندرونی ملک کو وہ ''ہند'' کہتے تھے، اس ہند نے یورپ جا کر اند کی اور اند نے انڈیا کی صورت اختیار کرلی۔ ہند والوں کو عرب ''ہندی'' اور خراسانی ''ہندو'' کہتے تھے، اور عرب ہندی کے جمع ''ہنود'' اور خراسانی ''ہندوان'' بناتے تھے۔

مسلمان جب اس ملک میں آئے تو ان میں سے اہلِ عرب نے اس ملک کو ہند کا، اور

اہلِ خراسان نے ہندوستان کا نام دیا، لفظ ستان جگہ یا زمین کے لیے فارسی اور سنسکرت دونوں میں بولتے ہیں، اس لیے ہندوستان ہندوستھان بھی ہوسکتا تھا۔

اس ملک میں جو بولی بولی جاتی تھی وہ بھی ایک نہ تھی، ہر صوبہ کی بولی الگ الگ تھی، لیکن مسلمانوں نے یہاں کی ہر بولی کا ایک ہی نام رکھا، یعنی ہندی یا ہندیہ۔

اس تفصیل سے معلوم ہوگا کہ اس سرزمین کا ایک نام ہند یا ہندوستان اور یہاں کی رہنے والی قوموں کا ایک نام ہندو اور یہاں کی مختلف زبانوں کا ایک نام ہندی مسلمانوں نے رکھا، اور حقیقت میں یہ مسلمانوں ہی کی ذہنیت اور ذہانت تھی، جس نے اس پوری سرزمین کو ایک ملک، اور یہاں کے رہنے والوں کو ایک قوم، اور یہاں کی بولیوں کو ایک زبان سمجھنے کا تصور پیش کیا۔

اس ملک میں عربی، ایرانی، فارسی اور ترک ترکی بولتے ہوئے آئے، مگر کچھ ہی دِنوں کے بعد یہاں کے اصلی باشندوں سے گھل مل کر تتلا تتلا کر یہیں کی سی کوئی زبان بولنے لگے۔ جس کا نام انہوں نے ہندی یا ہندوی رکھا، ورنہ ہندی نام کی کوئی زبان اس ملک میں ان کے آنے سے پہلے نہیں بولی جاتی تھی، اس زبان نے ترقی شروع کی تو گجرات میں اس کو گوجری، دکھن میں دکھنی اور اودھ میں اودھی کہنے لگے، لیکن صوبہ وار ناموں کو چھوڑ کر پورے ملک کی اس ملی جلی بولی کا نام ہندوستان کی نسبت سے ہندوستانی بھی پکارا جانے لگا۔ میں نے آج سے چند سال پہلے یہاں ''ہندوستان میں ہندوستانی'' کے نام سے جو مقالہ پڑھا تھا، اس میں ہندوستانی نام کے پرانے تاریخی حوالے پیش کیے ہیں۔

شاہجہان کے زمانہ میں جب دہلی شاہجہان آباد بنی تو شاہی قلعہ یا بازار کے لیے ترکی لفظ ''اردو'' اردوئے معلّیٰ کی توصیفی ترکیب سے رواج پایا اور صوبہ وارئی دیسی بولیوں کے لیے اس اردوئے معلّیٰ کی شاہی بولی کا ڈھنگ اس زبان کی صحت اور صفائی کا معیار بنا، اور اس طرح اس نئی معیاری بولی کو اضافت کے ساتھ ''زبانِ اردوئے معلّیٰ'' کہنے لگے، اور آج سے کوئی ڈیڑھ سو برس پہلے زبانِ اردوئے معلّیٰ کی لمبی ترکیب کے بجائے ''زبانِ اردو'' یعنی اردو کی زبان بنی، اور پھر اس سے بھی مختصر ہو کر ''اردو'' ہوئی۔

جب انگریزوں کے اقبال کا ستارہ چمکا، تو فورٹ ولیم میں سیاست کے کھلاڑیوں نے علم و دانش کے پانسے پھینکے، دُور بینی سے ملک کی دو قوموں کو جو ایک ہزار سال کی محنت اور جد و جہد کے بعد ایک قوم بنی تھیں، جس کا تمدن، جس کی زبان اور جس کی سیاست ایک ہو رہی تھی، اس کو پھر

دو قوموں میں بانٹ کر علیحدہ علیحدہ کیے جانے کی کوششیں شروع کیں، اور ہندی اور ہندو
اُردو زبانیں بنا کر ایک کے لیے پنڈت اور دوسری کے لیے منشی اور مولوی نوکر رکھ کر دو زبانو
لیے سامان درست کر لیا۔ ابھی اٹھارہویں صدی ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ فرنگی جادوگرو
منتر سے اُردو اور ہندی کے دوخاکی پتلے فولادی سپاہی بن کر ملک کے طول و عرض میں کٹنے مرنے
ہندو بھائیوں کے دلوں میں یہ خیال زور پکڑنے لگا کہ اب جب مسلمانوں کی سل
کے دباؤ سے وہ آزاد ہو چکے ہیں تو ہم کو اسلامی اثر کی ہر چیز سے آزاد ہونا چاہیے، اس
انگریزوں کی تفریق کی سیاسی تحریک بہت کارآمد ثابت ہوئی، اور سب سے پہلے اس کا اثر
کے معاملہ میں ظاہر ہوا، اور ہندی کے نام سے ایک زبان کی تبلیغ شروع ہوئی، اور بعض صوبو
یہ کیا گیا کہ اُردو خط تک عدالتوں سے خارج کر دیا گیا، اور اب یہ تحریک یہاں تک زور پکڑ رہی
کہ یہ کوشش کی جارہی ہے کہ اس صوبہ کے چند شاعروں نے جس بھاشا میں کچھ مذہبی نظمیں
لکھی تھیں وہی ملک کی زبان بنادی جائے۔

لیکن اس کے برخلاف ملک کے بہت سے سمجھدار ہندو اور مسلمان یہ چاہتے ہیں
ہمارے بزرگوں نے ایک ہزار سال کی محنت میں جس زبان کو پیدا کیا اور بڑھایا اور یہاں تک
دیا وہی ہمارے دیس کی زبان اور ہندو مسلمان دونوں قوموں کے میل ملاپ کی پہچان ہو۔

بہر حال اب صورت یہ ہے کہ اس زبان کی جگہ جس کو ہم بولتے ہیں، اور جس کو ہما
بزرگ ہندی یا ہندوی کہتے تھے ہندو بھائی زبردستی اپنی ایک خاص زبان اور خاص رسم خط کو
کہنے لگے، اور اس نام کو اس زبان کے معنی میں اتنا انہوں نے برتا کہ وہ انہی کی چیز ہو گ
مسلمانوں نے بھی غیرت کے مارے غیرت برتی، اور خوشی سے یہ نام ان کے حوالہ کر دیا، ا
زبان کو پہچان کے لیے ہندی یا ہندوی کے بجائے اُردو کہنے لگے اور اس طرح سارے ہند
کے میدان کو چھوڑ کر صرف اُردوئے معلّٰی کی چہار دیواری میں سمٹ کر رہ گئے۔

یہ حالت دیکھ کر آج سے چند سال پہلے اسی یونیورسٹی کے یونین ہال میں س
پہلے یہ تحریک پیش کی گئی کہ اس زبان کا نام "اُردو" کے بجائے جو اُٹھارویں صدی کے خ
ایجاد ہے، جب واقعی ہندوستان کی شاہی سمٹ کر اُردوئے معلّٰی کے صحن ایوان میں محدود ہو گ
اس کو واقعی طور سے اس کے پرانے نام ہندوستانی سے یاد کیا جائے، جو اُس وقت کا نام ہے
ہندوستان کی شہنشاہی سارے ملک ہندوستان میں پھیلی ہوئی تھی، تا کہ یہ زبان پورے م

مملکت کا دعویٰ کر سکے۔ مسلمانوں کو یہ سمجھنا کہ یہ تجویز ہندوؤں کی خوشنودی کے لیے ہے، یا ہندوؤں کا یہ سمجھنا کہ یہ اُن کو دھوکا دینے کے لیے سازش کی جا رہی ہے بدگمانی کی انتہا ہے۔

یہ تحریک خالص لسانی اُصول و مبادی کی بناء پر اُٹھائی گئی ہے، جس کے بہت سے سبب ہیں، میں ان میں سے ایک ایک کو بہت ہی اختصار کے ساتھ بیان کرتا ہوں۔

۱۔ اس زبان کے دو پرانے نام تاریخوں میں ملتے ہیں، زیادہ تر ہندی یا ہندوی اور اس کے بعد ہندوستانی، اب چونکہ ہندی کا نام ایک خاص زبان اور رسم خط کے لیے بولا جانے لگا ہے، اس لیے دوسرے پرانے نام ہندوستانی کو اس زبان کے لیے خاص کرنا چاہیے، جس کو اب غلطی سے ''اردو'' کہنے لگے ہیں۔

۲۔ دنیا کی ساری یا اکثر زبانوں کے نام قاعدہ یہ ہے کہ زبان اس قوم کی نسبت سے مشہور ہوتی ہے، جو اس کو بولتی ہے، یا اس ملک کی نسبت سے موسوم ہوتی ہے، جس میں وہ بولی جاتی ہے، اُسی اُصول کی بناء پر عرب کی زبان عربی، فارس کی زبان فارسی، ترکستان کی زبان ترکی، انگلستان کی انگلش، فرانس کی فرنچ، جرمن قوم کی جرمن، ترکی قوم کی ترکی وغیرہ کہی جاتی ہے، اسی اصول کے مطابق اس زبان کو جو ہندوستان کے طول و عرض میں بولی جاتی ہے، ہندوستانی کا نام دینا چاہیے۔

۳۔ ایک شائستہ اور مہذب زبان کا خاصہ یہ ہے کہ اس کے نام لینے کے ساتھ وہ قوم یا ملک سننے والے کی سمجھ میں آجائے، جس کو اس زبان سے نسبت ہے، نہ یہ کہ زبان کا نام لینے کے بعد اس کے ساتھ ایک تاریخی یا تعریفی فقرہ اضافہ کیا جائے، جس سے اس کے جنم بھومی کی کہانی معلوم ہو، لفظ ''اردو'' سے اس قسم کی کوئی مدد ذہنِ انسانی کو نہیں ملتی۔ اس لیے اس کی جگہ اس کے اصلی نام ہندوستانی کو رواج دینا چاہیے۔

۴۔ ہم کو اپنی بولی کا ایک ایسا نام رکھنا چاہیے جس کے سننے کے ساتھ یہ معلوم ہو جائے کہ یہ اس پورے ملک کی بولی ہے، لفظ اردو کے ساتھ اس قسم کا کوئی تصور ذہن میں نہیں آتا، برخلاف اس کے ہندوستانی نام بولنے کے ساتھ پورے ملک کا نقشہ ہمارے ذہن میں آجاتا ہے، اور اس کے پورے ملک کی بولی ہونے کا یقین منطق کی آمیزش کے بغیر، صرف نفسیاتی اثر سے ہمارے اور ہر سننے والے کے دل کے اندر پیدا ہو جاتا ہے۔

۵۔ اس زبان کو ایک غیر متعلق بدیسی لفظ سے موسوم کرنے سے ہر اجنبی کے ذہن میں یہ خیال آتا ہے کہ یہ جیسا بدیسی نام ہے، ویسی ہی بدیسی زبان بھی ہوگی، اور ہم کو اس کی اس غلط فہمی کو

دُور کرنے کے لیے ایک لمبی تقریر کی ہمیشہ ضرورت ہوتی ہے، یہ نقص ہندوستانی نام قبول کرنے سے فوراً دُور ہو جاتا ہے۔

۶۔ ہم کو اپنی زبان کے لیے ایک ایسا نام چاہیے جس سے ملک کے ہر صوبہ کو برابر کی نسبت ہو، تاکہ ہر صوبہ اس کو اپنے وطن کی بولی سمجھنے اور قرار دینے کا برابر کا دعویٰ کر سکے، لفظ اردو میں یہ بات نہیں، یہ بات ہندوستانی کو حاصل ہے، جس کی بناء پر صرف لکھنؤ اور دہلی ہی نہیں بلکہ بمبئی، مدراس، لاہور، کلکتہ، پٹنہ، پشاور سب کو اس کی ملکیت کا حق پہنچتا ہے اور سب کو اس سے یکساں ملکی اور وطنی محبت معلوم ہوتی ہے اور کسی صوبہ میں وہ اجنبی اور بے گانہ نہیں قرار دی جا سکتی ہے۔

۷۔ لفظ اردو میں ایک فوجی تسلط اور شخصی شہنشاہی کی تاریخ چھپی ہوئی ہے جس سے مرعوبیت کے سوا کوئی محبت کا جذبہ نمایاں نہیں ہوتا اگر ہم اپنے پیارے ملک کی نسبت سے اس زبان کو پکاریں، تو اس نام سے ہر ہندوستانی کے دل میں وطنی محبت کا جذبہ اُبھرے گا۔

۸۔ اس ملک کا نام ہندوستان مسلمانوں کے آنے کے بعد پڑا، اسی طرح یہ بولی بھی مسلمانوں کے اس ملک میں آنے اور اس ملک کے لوگوں سے میل جول پیدا ہونے کے بعد نکلی، اس لیے اس بولی کا نام ہندوستانی رکھنا مناسب ہے، تاکہ تاریخی مناسبت کے ساتھ ہندو مسلمانوں کے برابر کے میل جول کی کہانی بھی ہم کو ہمیشہ یاد رہے۔

۹۔ لفظ اُردو سے یہ دھوکا ہوتا ہے کہ مسلمان ترکستان وخراسان سے کوئی بولی لے کر یہاں آئے تھے، جس کو وہ ترکی میں اردو کہتے ہیں، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ باہر سے آنے والے مسلمانوں کی زبانیں اور تھیں اور یہ وہ بولی ہے، جس کو انہوں نے ہندوستان آکر اختیار کر لیا، یہ واقعہ اس بولی کو ہندوستانی کے اصلی اور صحیح نام سے پکارنے سے ساری دنیا کے سامنے روشن ہو جاتا ہے اور اس کے بدیسی پن کا بے وجہ شبہ دُور ہو جاتا ہے۔

۱۰۔ اس زبان کو اردو کہنے کا نتیجہ یہ ہے کہ ناواقف گرائمرین اس کی صرف ونحو کو عربی وفارسی کی صرف ونحو سے جانچ کر اس کے اصول بنانے لگے، اور انہوں نے اس غلط طریق وروش کی بناء پر بہت سی غلطیاں کیں اور اس کے جوڑوں کو عربی اور فارسی قاعدوں سے جوڑنے لگے، گو اب ہماری زبان کے نئے نحویوں نے اس غلطی کو ہر طرح سے دُور کرنے کی کوشش کی، مگر ابھی تک بات حلق سے نیچے نہیں اُترتی ہے۔ اب اس کو عام طور پر ہندوستانی کہہ کر پکارنے سے اس زبان کی صرفی ونحوی اور لغوی تحقیقات کا رُخ ایران وخراسان وترکستان کی طرف سے مڑ کر ہندوستان کے

صحیح قبلہ کی طرف ہو جائے گا اور اس سے زبان کی اُصولی ولغوی تحقیقات کی بہت سی راہیں کھلیں گی۔

۱۱۔ اگر ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ یہ پورے ملک کی مشترک زبان ہے تو اس دعویٰ کی اس سے زیادہ مضبوط دلیل کوئی اور نہیں ہو سکتی کہ اس کا نام ہندوستانی ہے، اس کے اس پرانے نام کو رفتہ رفتہ بھلا دینے سے غلط طور کی ہمدردی کر کے ہم نادانستہ اس کے دعویٰ کی بنیاد کھوکھلی کر رہے ہیں۔

۱۲۔ چونکہ شروع شروع میں جو پرتگالی یا اسپینی یا اور اگلے یورپین یہاں آئے بلکہ خود انگریزوں نے بھی اس زبان کو صحیح طور سے ہندوستانی کہا تو ہم میں سے اکثروں کو یہ دھوکا ہوا کہ یہ نام انگریزوں کا بخشا ہوا ہے، حالانکہ اس زبان کا یہ نام ہم اپنے ہندوستانی کے مقالہ میں بتا چکے ہیں کہ بادشاہ نامہ اور تاریخ فرشتہ تک میں موجود ہے، فرشتہ میں عادل شاہ ثانی والی بیجاپور کے متعلق ہے کہ ''تا بہ ہندوستانی متکلم نمی شد'' شاہجہان کی درباری تاریخ بادشاہ نامہ میں ہے۔ ''نغمہ سرایانِ ہندوستانی زبان'' تلاش سے اور بھی مثالیں مل سکتی ہیں، اس لیے یہ شبہ دُور ہو جانا چاہیے کہ اس زبان کا یہ نام فرنگیوں نے رکھا ہے، بلکہ یقین کرنا چاہیے کہ ہندی کے بعد ہماری زبان کا یہ نام ہے جو ہمارے بزرگوں نے رکھا تھا، اور ہم کو بھی اس نام کو باقی رکھنا چاہیے۔

۱۳۔ اہلِ نظر سے چھپا نہیں کہ اس زبان کی صحیح تاریخ کے سمجھنے میں میر امنؔ دہلوی سے لے کر سر سید، بلکہ آزادؔ مرحوم تک سے غلط فہمی ہوئی کہ یہ لشکری بولی ہے یا بازاری۔ جیسا کہ میر امنؔ کا بیان ہے:

> ''جب اکبر بادشاہ تخت پر بیٹھے، تب چاروں طرف کے ملکوں سے سب قوم قدر دانی اور فیض رسانی اس خاندان لاثانی کو سُن کر حضور میں جمع ہوئے، لیکن ہر ایک کی گویائی اور بولی جدی جدی تھی، اکٹھے ہونے سے آپس میں لین دین سودا سلف، سوال جواب کرتے ایک زبان مقرر ہوئی۔''
>
> جب حضرت شاہجہان صاحب قرآن نے ـــــ شہر دہلی کو اپنا دارالخلافت بنایا ـــــ اور وہاں کے بازار کو اُردوئے معلّٰی خطاب دیا۔

سر سید نے بھی حکایت شاہجہان کے عہد کی نسبت لکھی ہے اور لکھا ہے کہ چونکہ یہ زبان خاص بادشاہی بازاروں میں مروج تھی اس واسطے اس کو زبان اُردو کہا کرتے تھے، اس غلطی کا سبب

صرف لفظ اُردو ہے، اس لیے اس نام کو باقی رکھنا اس غلط تاریخ کا باقی رکھنا ہے اور اس کی اصلی تاریخ کو جو اب پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے، برباد کرنا ہے۔

۱۴۔ بعض دوست کہتے ہیں کہ چونکہ نہرو رپورٹ اور پنڈت جواہر لال نے اپنی آپ بیتی میں ''ہندوستانی زبان'' کی اکثریت کو تسلیم کیا ہے اور اپریل ۱۹۳۶ء میں بھارتیہ ساہتیہ پرشد کے اجلاس ناگپور میں ''ہندی یعنی ہندوستانی'' کی تجویز منظور ہوئی ہے، اور ان سب سے مراد ''ہندی'' ہے، اس لیے ہندی اور ہندوستانی ہم معنی لفظ ہو گئے ہیں، اس لیے ہم کو اس لفظ سے پرہیز کرنا چاہیے۔

میری عرض یہ ہے کہ یہ تو مسلمانوں کی بے احساسی سے ایسا ہوا، شاہ عبدالقادر صاحب کے زمانہ تک اردو کا نام ''ہندی'' متعارف تھا، اور سرسید نے آثار الصنادید کے طبع اوّل میں اُردو کے لیے ہندی کا لفظ استعمال کیا ہے، اور اسی کو ہندی کہتے تھے۔ ہندی والوں نے اس لفظ پر ایسا قبضہ کیا کہ آپ کو اس نام پر سے ملکیت کا دعویٰ اُٹھا لینا پڑا، اب ایک لفظ ''ہندوستانی'' رہ گیا تھا جو خالص طور پر اردو کے معنوں میں ہمیشہ استعمال ہوا ہے، اگر آپ اس کو بھی چھوڑ دیں گے تو دوسروں کے قبضۂ مخالفانہ سے وہ ہرگز نہیں بچ سکتا۔ یہی وقت ہے کہ آپ معاملہ کی سنجیدگی کو سمجھیں اور اپنے قبضہ سے خود ہاتھ اُٹھا لینے کا گناہ نہ کریں، ہم اپنے بدگمان دوستوں کو باور کرانا چاہتے ہیں کہ لفظ ہندوستانی مسلمانوں کے اصرار سے اور مسلمانوں ہی کی طفل تسلی کے لیے رکھا گیا ہے اور اس سے مراد ہماری وہی زبان ہے جو ہماری عام بول چال میں ہے، ہم کو جو کچھ شکایت ہے وہ یہ ہے کہ ہندی اور ہندوستانی کو ہم معنی اور مترادف کیوں ٹھہرایا گیا ہے، افسوس ہے کہ ایسے مسئلہ کو جو سراسر ادبی اور لسانی ہے، غلط طور سے سیاسی بنایا جا رہا ہے، جذبات سے خالی ہو کر واقعات اور دلائل پر غور کرنا چاہیے اور وہ قدم اُٹھانا چاہیے جو ہماری زبان کی حفاظت اور ترقی کا باعث ہو۔

یہ تجویز کسی تحریک و تائید اور رائے شماری کی غرض سے نہیں پیش کی جارہی ہے، اور نہ اس طرح سے ادبی و لسانی مسئلوں کا فیصلہ ہوتا ہے، بلکہ جو کچھ ہمارے سامنے ہے وہ اپنی زبان کی بھلائی اور ترقی کا خیال ہے۔ اس قسم کی تحریکیں پیدا ہوتی ہیں، پھر آہستہ آہستہ بڑھتی جاتی ہیں، یہاں تک کہ وہ رائے عامہ کو متاثر کر لیتی ہیں، اردو کا نام اردو کسی ایک شخص یا کانفرنس نے رکھا یہ تو پہلے کسی کسی کی زبان پر آیا پھر بڑھتا اور پھیلتا گیا، یہاں تک کہ سب پر چھا گیا، غور کیجیے کہ ابھی چند سال ہوئے کہ اس خیال کو کہ اردو کا موزوں نام ہندوستانی ہے آپ کے درمیان پیش کیا گیا اور

کبھی کبھی مضمونوں میں ادھر اشارے کیے گئے، اتنے پر یہ نام مدراس وغیرہ کے رسالوں میں چھپنے لگا، اور کہیں کہیں اس کا چرچا ہونے لگا، یہاں تک کہ آج اس کھلے اجلاس میں اس پر بحث تک نوبت پہنچ گئی، غرض ضرورت مباحثہ اور مناظرہ کی نہیں ہے، بلکہ اس کی ضرورت ہے کہ جو اصحاب اس تجویز سے اتفاق رکھتے ہیں وہ اپنی زبان اور قلم سے اس کا استعمال شروع کر دیں، اس سلسلہ میں ہماری مدد سب سے زیادہ اخباروں اور رسالوں کے ایڈیٹر کر سکتے ہیں، اُمید ہے کہ وہ ادھر توجہ فرما کر اپنی زبان کے قدیم نام کو زندہ کر کے پچھلے سو برس کی غلطی کو دُور کریں گے، اور ثابت کریں گے کہ ہندوستان کی عام زبان کا نام ''ہندوستانی'' ہی ہونا زیادہ موزوں ہے، اور یہ وہی زبان ہے جو عام طور سے ہم ہندوستانیوں کے بول چال میں ہے۔

یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ اردو کا علمی نام ہندوستانی رکھنے کی تحریک آج کل کی زبانی کشمکش کا نتیجہ ہے، بلکہ عجیب اتفاق یہ ہے کہ اسی ناگپور میں جس ساہتیہ پرشد نے اپنا فیصلہ سنایا، آج سے چھبیس برس پہلے ۱۹۱۰ء کے مسلم لیگ کے اجلاس میں مرزا عزیز مرزا مرحوم نے بعینہٖ یہی تحریک پیش کی تھی اور اس کے بعد ساہتیہ پرشد کے اجلاس سابق سے چند سال پہلے اسی یونیورسٹی کے یونین میں یہ تجویز دوبارہ پیش کی گئی تھی۔

یہ سمجھنا بھی درست نہیں کہ اس تجویز کے پیش کرنے والوں کا یہ مقصد ہے کہ ہم اپنی زبان میں کوئی ایسی تبدیلی کر لیں جس سے وہ ہندی یا ہندی کے قریب بن جائے، حاشا وکلا، اس قسم کی کوئی بات نہیں ہے، بلکہ بعینہٖ اسی اردو، اسی زبان، اسی بول چال کو جو ہم بولتے ہیں، ہم ہندوستانی کہتے ہیں۔

ہم کو اس سے بھی اختلاف نہیں کہ اس زبان کا گھریلو نام اردو باقی رہے، لیکن عمومی طور پر اس کے پرانے نام ہندوستانی ہی کو رواج دیا جائے، ہمارے بزرگوں نے اس زبان کو دو قسموں میں تقسیم کیا تھا، ایک کا نام ریختہ جو غزل کی زبان تھی، اور دوسرے کا نام ہندی بتایا تھا، جو عام بول چال کی زبان تھی، ہندی کا لفظ چھن گیا، اب جو کچھ ہم چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ آپ اس کے پرانے نام ہندی کی جگہ اس کے دوسرے پرانے نام ہندوستانی کو رواج دیجیے، خواہ اپنی غزلوں کا نام ریختہ کی جگہ اردو ہی رکھیے۔ اس میں کچھ ہرج نہیں، مگر اپنی علمی، تعلیمی، وطنی اور سیاسی تحریکات میں عام طور سے اس کو ہندوستانی کے صحیح نام سے یاد کر کے ثابت کیجیے کہ یہ پورے ملک ہندوستان کی زبان ہے اور اس کا یہی نام اس پورے ملک کی زبان ہونے کی دلیل ہے۔

ہم اس فریب میں مبتلا نہیں ہیں کہ اس صحیح نام ہندوستانی کے رواج دے دینے سے ہماری زبان کی ساری مشکلیں ختم ہو جائیں گی گویا یہ نام کوئی جادو کی چھڑی ہے جس کے گھماتے ہی ساری بلائیں دُور ہو جائیں گی، بلکہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ آج جب ہم اپنی زبان کی اصلی پوزیشن کو دنیا پر واضح کرنے اور اسکے ہمہ گیر تخیل کو ثابت کرنے، اور اس کو سارے ملک کی زبان بنانے کا تہیہ کر رہے ہیں، تو ضرورت ہے کہ ہم سب سے پہلے اس کو اس کے اس نام سے روشناس کرائیں جس سے اس کی اصلی حیثیت واضح ہوتی ہے اور پورے ملک کی اس کے اندر سمائی ہوتی ہے۔ اور یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ واقعی اس پورے ملک کی زبان ہے، اور جو اس پورے ملک کی زبان بننے کی مدعی ہو اس کا یہی نام ہونا چاہیے۔

ہم کو اُمید ہے کہ اس زبان کے بہی خواہ اس تحریک کی تائید کریں گے، اور بحث و مناظرہ کے بجائے جو افسوس ہے کہ ہر مفید تحریک میں ہماری عادت ہوگئی ہے، عملاً اس کے رواج دینے کی کوشش کریں گے، تا کہ اس کا جو نام صرف خواص کو معلوم ہے، وہی عوام میں پھیل جائے۔

ابھی مولوی عبدالحق صاحب نے آپ کے سامنے جو صدارتی خطبہ پڑھا ہے، اس میں انگریزی کے پرانے اقتباسات انہوں نے پیش کیے ہیں، آپ نے خیال کیا ہوگا کہ ان میں ہر جگہ اس زبان کا نام یورپ کے سیاحوں، تاجروں، کمپنی کے حاکموں اور پڑھے لکھے ہندوستانیوں کی زبان پر ہندوستانی ہی آیا ہے، اس سے معلوم ہوگا کہ اس کا اصلی نام پہلے بھی مشہور و معروف تھا، جو اب عام طور سے متروک ہو رہا ہے، ہمارا مقصد اسی غلطی کی اصلاح اور اسی مرے ہوئے نام کو دوبارہ جلانا ہے۔

ooo

گاندھی جی کی ہندوستانی سبھا

سید ہاشمی فرید آبادی

محبان اردو کو گاندھی جی کا ''ساہتیہ پرشد'' غیرت وحرکت میں لایا تھا۔ بعض کانگریسی مسلمانوں اور خاص ہندو دوستوں نے انہیں پرشد کی علم برداری کرنے پر ٹوکا تھا، لیکن کانگریسی وزارتوں کے پہلے عہد اقتدار (نومبر ۱۹۳۹ء) تک اُن کے خیالات میں کسی تبدیلی کا پتہ نہیں چلتا۔ اسی دسمبر میں دہلی کی اردو کانفرنس کو جو خط بھیجا، اس میں بھی اردو کو مسلمانوں کی اور ہندی کو ہندوؤں کی زبان بتایا تھا۔ ہماری زبان (۱۶ جنوری ۱۹۴۰ء) میں گاندھی جی کے اس خیال پر تاسف کیا گیا اور ان کے مقابلے میں سرتیج بہادر سپرو، مہاراجہ کشن پرشاد، راجہ پرتاب گیر وغیرہ ہندو اور بعض مسلم اکابر کے اقوال دہرائے گئے تھے۔ اسی قسم کی تنقید دوسرے اخباروں میں ہوئی پنجاب کے چند کانگریسی مسلمانوں سے گفتگو میں پنڈت جواہر لال نہرو نے گاندھی جی کی تردید کی اور خود اپنے کنبے برادری کی زبان کا اردو ہونا بدیہی مثال میں پیش کیا۔ مولوی صاحب نے گاندھی جی کے خط کا شکریہ لکھنے میں ان کی اس غلطی پر توجہ دلائی۔ جواب (مورخہ ۷ مارچ ۱۹۴۰ء) میں مہاتما نے تسلیم کیا کہ اردو اپنے علاقے میں ہندو مسلمان دونوں کی مادری زبان ہے اور اُن کا مطلب تو یہ تھا کہ سبھی ہندو، اردو رسم خط اور مسلمان ہندی تحریر سے شناسائی حاصل کریں۔ اُن کا اصل انگریزی خط (اردو ترجمہ کے ساتھ) یکم اپریل کے ہماری زبان میں چھپا اور اُمید ظاہر کی گئی کہ اس تحریر سے کئی غلط فہمیاں دُور ہو جائیں گی: ''فرقہ واری کشیدگی کا ایک بڑا سبب زبان کا تنازعہ بھی رہتا ہے اور یہ رائے اب بھی درست ہے کہ کانگریسی لیڈروں کے لیے کسی ایک (زبان) کا بیڑا اُٹھانا بڑی سیاسی غلطی تھی مگر اس کا احساس غنیمت ہے کہ بہت جلد ہو گیا۔''

آئندہ چار سال تک گاندھی جی اور کانگریس کو زبان کے مسئلے پر غور و بحث کی فرصت ہی

نہ مل سکی ہوگی۔ ۱۹۴۲ء میں کانگریس خلاف قانون (باغی) جماعت قرار دی گئی۔ اس کے اکثر اکابر ورہنما قید کر لیے گئے۔ ۱۹۴۴ء میں نجات ملی۔ اب اُن کی طاقت ور حریف مسلم لیگ ہوگئی تھی۔ گاندھی جی اور اُن کے رفیق پوری قوت سے اس کے دوقومی نظریے کی تردید اور لیگ کو نیچا دکھانے کی سعی و تدبیر میں منہمک تھے۔ رسم و آئین کے خلاف کئی سال سے برابر ایک مسلمان (حضرت امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد) کو کانگریس کا صدر بنائے رکھا تھا۔ بظاہر اسی یک قومی نظریے کے مظاہرے کے لیے ضرورت ہوئی کہ ہندی اردو کی جداگانہ ''قومیت'' جسے خود تیار کیا تھا، مٹائی (یا چھپائی؟) جائے۔ نئی لسانی حکمت عملی کا آغاز ۱۹۴۲ء کو کہہ سکتے ہیں جب کہ گاندھی جی کے مشہور کروڑ پتی مرید سیٹھ جمن لال بجاج نے ایک ''ہندوستانی پرچار سبھا'' کی وردھا میں بنا ڈالی۔ لیکن سیٹھ صاحب کا اسی زمانے میں انتقال ہوگیا۔ ملک میں خون ریز فسادات اور گاندھی جی وغیرہ اسی سال قید ہوئے۔ ''سبھا'' کی پہلی بڑی محفل جمانے کی فروری ۱۹۴۵ء میں نوبت آئی۔ جناب مولوی صاحب کو خاص طور پر مدعو کیا تھا اور جب انھوں نے بمبئی کی اردو کانفرنس میں شرکت کا عذر کیا تو گاندھی جی نے اُن کی خاطر سبھا کی تاریخیں بدلنی منظور کیں اور انہیں شریک کیے بغیر نہ رہے۔ مگر قبل ازیں کہ ہم جناب مولوی صاحب کی زبانی سبھا کا حال سنیں چند کلمے بمبئی اردو کانفرنس کی نسبت لکھنے ضروری ہیں جو موصوف کی صدارت میں ۲۳-۲۵ فروری ۱۹۴۵ء کو منعقد ہوئی۔ کانفرنس کا انتظام انجمن ترقی اردو کی شاخ بمبئی نے کیا تھا، لیکن عام اہل شہر نے بڑے ذوق شوق سے حصہ لیا۔ کمیونسٹ اور ترقی پسند مصنفین اسلامی انجمنوں اور اہل مدرسہ کے شبانہ بہ شانہ اُردو کی حمایت میں صف بستہ نظر آئے۔ ایک ہی جلسے میں مولوی صاحب کی پرسوز تقریر پر ''عمارت فنڈ'' کے لیے گیارہ ہزار روپیہ چندہ ہوا۔ جوشیلے نوجوانوں نے یقین دلایا کہ وہ اس سے کہیں زیادہ رقم آئندہ فراہم کر کے بھیجیں گے۔ کانفرنس کے مشاعرے میں جو مولانا حسرت موہانی مرحوم کی صدارت میں ہوا تھا، جناب مولوی صاحب کی ایک پنسلی تصویر دو ہزار روپے میں نیلام ہوئی۔ مجموعی طور پر ان جلسوں نے واضح کر دیا کہ بمبئی بہت جلد لاہور و حیدر آباد کی طرح اُردو زبان کا بڑا مرکز بن جائے گا۔ کانفرنس کی نمائش میں اردو کی ترقی نقشوں کے ذریعے دکھائی گئی تھی۔ معلوم ہوا کہ اُس وقت ہماری زبان کے بارہ روزنامے اور پچاس کے قریب ہفت روزہ اخبارات و رسائل شہر بمبئی میں چھپتے تھے۔ گجراتی اور مرہٹی دونوں کو اردو مطبوعات نے دبا لیا تھا۔

گاندھی جی کی ہندوستانی سبھا کے متعلق جناب مولوی صاحب انجمن کی سالانہ کیفیت

۱۹۴۵ء (ص ۳۴) میں تجویز فرماتے ہیں:

''۲۶ فروری کو کلکتہ میل سے وردھا روانہ ہوا۔ وردھا میں ''ہندوستانی پرچار سبھا'' کا پہلا سالانہ جلسہ تھا۔ گاندھی جی نے اب ہندی کی طرف سے رُخ موڑ کر ہندوستانی کی طرف نظر التفات فرمائی ہے۔ اب ہندی کو ان کی ضرورت بھی نہیں رہی تھی، وہ اپنا کام کر چکے تھے! میرا ارادہ شریک ہونے کا نہ تھا کیوں کہ میں جانتا تھا کہ ان جلسوں اور اُن تحریکوں میں شریک ہونا لاحاصل ہے، لیکن ڈاکٹر تاراچند اور پنڈت سندر لال میرے پاس خاص طور پر بھیجے گئے دو تین روز تک برابر صبح شام اُن سے گفتگو اور بحث رہی۔ آخر میں شرکت پر تو رضامند ہو گیا مگر میں نے صاف کہہ دیا کہ میں اس سبھا یا اس کی کمیٹی کا ممبر نہ بنوں گا۔ یہ بات اُن صاحبوں نے قبول کر لی۔ اب جو جلسے کی تاریخ دیکھی تو وہی نکلی جو ہماری بمبئی کی اردو کانفرنس کی تھی۔ ادھر گاندھی جی اپنے دعوت نامے بھیج چکے تھے۔ ان صاحبوں نے گاندھی جی کو اطلاع دی۔ تب گاندھی جی نے پہلی تاریخیں منسوخ کر کے دوسرے دعوت نامے بھیجے تاکہ میں بمبئی سے وقت پر وردھا پہنچ سکوں۔

۲۷ فروری کو سبھا کا دوسرا اجلاس ہوا۔ سہ پہر کی نشست میں گاندھی جی نے (بہ حیثیت صدر) مختصر سی تقریر کی۔ اس کے بعد میں نے اپنی تقریر میں کہا کہ اکھل بھارت ساہتیہ پرشد کے اجلاس ناگ پور (۱۹۳۶ء) میں میری تحریک یہی تھی کہ ہندوستانی اختیار کی جائے۔ گاندھی جی نے اسے ردّ کر دیا۔ آج دس برس بعد وہی تجویز خود پیش کر رہے ہیں۔ اگر اس وقت منظور کر لیتے تو یہ دس سال کا نقصان نہ ہوتا۔ زمانہ آج کل ایسی تیزی سے بڑھ رہا ہے کہ یہ دس سال پچاس سال کے برابر ہیں۔۔۔۔ گاندھی جی نے اپنی آخری تقریر میں فرمایا کہ میں نے (۱۹۳۶ء میں) مولوی صاحب کو دوست کر کے بلایا تھا، وہ دشمن ہو کر گئے، غلطی میری تھی۔ میں اُن کی بات کو نہیں سمجھا۔ آج میں اپنی غلطی کا کفارہ ادا کر رہا ہوں! ☆

جناب مولوی صاحب نے سبھا کی مجوزہ کمیٹی میں شرکت سے قطعی انکار کر دیا، لیکن گاندھی جی نہ صرف سبھا کے صدر بنے بلکہ اُنہوں نے ''ہندی سمیلن'' سے استعفیٰ بھیج دیا۔ اس پر ہندی والوں نے بڑا شور مچایا۔ سمیلن کے صدر ٹنڈن جی نے شکایت بھرے خط لکھے۔ گاندھی جی

☆ اگرچہ سبھا میں گاندھی جی کی عقیدت مند زیادہ تھے۔ تاہم ایک صاحب (مسٹر ویلکٹ راؤ) نے صاف صاف کہہ دیا کہ ہندی ہندوستانی کا جھگڑا مہاتما جی کی ضد سے پیدا ہوا تھا (ہماری زبان، ۱۶ر مارچ ۱۹۴۵ء)

نے اُن کو یقین دلایا کہ وہ اب بھی ہندی کے ویسے ہی (درپردہ؟) حامی ہوں جیسے پہلے تھے۔ یہ خط کچھ مدت بعد اَمرت بازار پتریکا، اور ہندوستان اسٹینڈرڈ میں منظر عام پر آیا۔ گاندھی جی کے یہ جملے نقل کرنے کے لایق ہیں:

> ''میں نے کوئی نئی راہ نہیں اختیار کی۔ بات یہ ہے کہ کبھی ایسا وقت ہوتا ہے جب میں کسی جماعت سے باہر رہ کر اس کی بہتر خدمات انجام دے سکتا ہوں اور کبھی اندر رہ کر۔ میں اب ہندی ساہتیہ سمیلن سے باہر رہ کر اس کی زیادہ خدمت کر سکتا ہوں۔'' (دیکھو ہماری زبان یکم فروری ۴۶ء)

ممکن ہے مہاتما جی مسٹر ٹنڈن کو بھی دم دلاسا دینا چاہتے ہوں، لیکن اسی سال ان کا ''ہریجن سیوک'' جو اردو رسم خط میں اُن کی ''ہندوستانی'' کا نمونہ بن کر شائع ہوا، اس کی زبان وہی مصنوعی اور نامانوس ہندی پائی جاتی ہے۔ ہندو مسلمان سبھی اردو شناسوں نے اس نئی انشاء پردازی کی مذمت کی۔ ۱۹۴۶ء کے ہماری زبان ہی میں بیسیوں مضمون اور مراسلے مخالفت میں چھاپے گئے۔

ooo

اردو سے ہندی تک

ڈاکٹر عبدالودود

اب جبکہ ایک طبقہ اردو زبان کو ماننے ہی سے انکار کر رہا ہے، ہمارے سامنے بہت سے مسائل بھی آ گئے ہیں۔ اردو ایک نئی تحریک کا مقابلہ کرنے پر مجبور ہے۔ اخبارات ورسائل کے ذریعہ اس غیر منطقی اور سطحی خیال کی ترویج کر کے لوگوں کے ذہن پراگندہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یشپال، ناگر اور ان کے ہمنوا اردو کے وجود ہی سے انکار کرتے ہیں۔ ایک طرف قومی یکجہتی کی بات کی جاتی ہے اور دوسری طرف یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اردو کو اپنا رسم خط چھوڑ کر دیوناگری رسم خط اپنا لینا چاہیے۔ اس سے قومی یکجہتی میں مدد ملے گی۔ تہذیب کے سرسبز و شاداب پودے کی ایک خوبصورت شاخ کاٹ دیجیے اور کہیے دیکھئے کتنا خوبصورت پودا ہے۔ اردو کے لیے دیوناگری رسم خط تجویز کرنے والے یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ رسم خط بدل دینے سے زبان کی اہمیت کم نہیں ہوتی۔ ابھی تو رسم خط تبدیل ہی نہیں کیا گیا اور آپ نے اردو کے وجود ہی سے انکار کر دیا۔ رسم خط تبدیل ہو جانے کے بعد تو آپ شاید اردو ہندی کی بحث میں پڑنا بھی پسند نہیں کریں گے۔ آپ کا واضح اعلان ہوگا کہ اردو ہندی میں ضم ہو چکی ہے۔

بڑی آسانی سے کہہ دیا جاتا ہے کہ اردو اور ہندی میں کوئی فرق نہیں قواعد ایک ہی ہے، جملوں کی ساخت ایک سی ہی ہے اور اردو ہندی کے افعال بھی ایک ہی ہیں۔ یہ چند دلیلیں یہ ثابت کرنے کے لیے پیش کی جاتی ہیں کہ اردو ہندی الگ الگ زبانیں نہیں بلکہ ایک زبان ہیں۔ اردو رسم خط فضول سا ہے اور اسے ناگری رسم خط اپنا لینا چاہیے۔ رسم خط کی تبدیلی سے اُردو کا جو حشر ہوگا وہ ظاہر ہے۔ سیکڑوں سال کی روشن تاریخ ختم ہو جائے گی۔ اردو کی ترقی و بقاء کی کوئی صورت باقی نہیں رہ جائے گی۔

ہندی کے پریمی اردو کو ہندی سے مختلف نہیں سمجھتے اسے ہندی کا ہی ایک روپ کہہ دیتے ہیں۔ افسوس کہ اردو والوں نے اس موضوع پر مفصل اظہارِ خیال نہیں کیا۔ ہندی کے مشہور لکھنے والوں کے اس خیال کو چیلنج نہیں کیا۔ ہم اردو کی انفرادیت اس کی اپنی اہمیت اور خوبیوں کا تو ذکر کرتے ہیں، لیکن ہندی سے اردو کس قدر مختلف ہے۔ اس کا تاریخی جائزہ نہیں لیتے۔ ضرورت ہے کہ ہمارے ان خیالات سے ہندی والے واقف ہوں انہیں اپنی باتیں سمجھانے کی کوشش کریں، لیکن کسی طرح ہندی کے اخبارات ورسائل ہمارے خیالات کی تشہیر تو کرہی نہیں سکتے۔ ان سے یہ اُمید فضول ہے یہ کام اردو ہی کے اداروں سے متعلق ہے۔ ہندی میں مختصر رسالے شائع کیے جائیں اور انہیں مفت تقسیم کیا جائے یا کم قیمت پر فروخت کیا جائے۔ ناگری رسم خط میں اردو سرمایہ منتقل کرنے والے ادارے بھی اس کام کی پہل کر سکتے ہیں۔

آئیے! ذرا ہم دیکھیں کہ ہندی کی عمر کتنی ہے۔ موجودہ ہندی شاعری کی تاریخ سو سال سے زیادہ نہیں ہے۔ نثر کی عمر شاعری سے کچھ زیادہ ہے۔ جدید اردو نثر اور ہندی نثر کا آغاز فورٹ ولیم کالج سے وابستہ ہے۔ ہندی نثر کی عمر ہندی شاعری سے پچاس سال زیادہ قرار دی جا سکتی ہے۔ اس طرح ہندی کی عمر ڈیڑھ سو سال سے زیادہ نہیں ہے۔ یہ میرا خیال ہے ہندی والے اسے ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں گے۔ اودھی اور برج کا سرمایۂ شاعری ہندی شاعری تصور کر لیا گیا ہے۔ ہندی والے اردو کے دکنی ادب پر بھی دعویٰ کر رہے ہیں۔ تھوڑی دیر کے لیے ان کا دعویٰ تسلیم ہی کر لیجیے اور ان سے پوچھیے جناب قلی قطب شاہ، ملا وجہی ہندی کے شاعر و نثر نگار ہیں۔ امیر خسرو ہندی کے شاعر ہیں۔ انشاء اللہ خان ہندی کے نثر نگار ہیں، لیکن آپ ولی، میر، سودا، آتش، ناسخ، مصحفی، جرأت، میر حسن، دیا شنکر نسیم، انیس، دبیر، غالب، مومن، ذوق اور ظفر کو بھی ہندی شاعر کیوں نہیں تسلیم کرتے۔ انشاء کی رانی کیتکی تو ہندی نثر کا نمونہ قرار دی جاتی ہے۔ لیکن انشاء کی شاعری ہندی شاعری کیوں نہیں مان لی جاتی۔ اس کا جواب نہیں دیا جائے گا اور خاموشی اختیار کر لی جائے گی۔

ہندی کے ادیب اور نقاد ایک زمانے سے اس فکر میں ہیں کہ ہندی کی قدامت ثابت کرنے کی کوشش کی جائے۔ برج اور اودھی کے شاعر ہندی کے شاعر تصور کیے جاتے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ برج اور اودھی کا ہندی سے کوئی تعلق نہیں۔ برج اور اودھی میں جو ادب ملتا ہے آج ان کی کلاسیکی حیثیت ہے۔ اسے ہندی ادبیات کا جز تسلیم نہیں کرنا چاہیے۔ آج بھی برج اور اودھی

بولی جاتی ہیں۔ ان بولیوں میں آج بھی لوک گیت لکھے جاتے ہیں۔ اگر یہ کہوں کہ لوک گیت کہے جاتے ہیں اور سینہ بہ سینہ محفوظ ہو جاتے ہیں تو زیادہ مناسب ہوگا۔ کیا آج برج اور اودھی میں کی جانے والی شاعری، ہندی شاعری کا ایسا ہی جز مان لی جائے گی۔ جیسا کہ سور اور تلسی کی شاعری؟ کیا آج برج اور اودھی نثر میں ایک مضمون لکھا جائے تو اسے ہندی کے مشہور جرائد میں جگہ مل جائے گی؟ یہ کبھی بھی گوارا نہیں کیا جائے گا اس کا بھی کوئی مدلل جواب آپ کو نہیں ملے گا۔

آج بھی سورداس کی برج اور تلسی داس کو اودھی موجود ہے۔ ہندی کے سرمایۂ شاعری میں جن بولیوں کی شاعری شامل کی گئی ہے۔ وہ بولیاں آج بھی موجود ہیں۔ اب یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جس ہندی کو بین الریاستی زبان کہا جاتا ہے اس کا ایک رنگ و روپ نہیں ہے۔ اس کی انفرادیت مشتبہ ہے۔

اردو ہندی سے صدیوں پرانی زبان ہے۔ اردو نے بولیوں پر کبھی دعویٰ نہیں کیا۔ ہندی شاعری کا آغاز اس وقت ہوا جب اردو ترقی کی بلندی پر پہنچ چکی تھی۔ دلی کی زبان پر آج کی زبان کا دھوکہ ہوتا ہے۔ میر حسن کی مثنوی، سحر البیان کے محاورات روزمرہ اور سلیس انداز بیان نے اسے قبول عام بخشا۔ مثنوی سحر البیان کے بہت سے اشعار ایسے ہیں کہ ترتیب بدل دینے سے وہ عام فہم جملے بن جاتے ہیں۔ دلی سے غالب تک لاتعداد اردو شعراء سرمایۂ شاعری میں بیش بہا اضافہ کر چکے تھے۔ دلی سے پہلے دکن میں اردو شاعری اور نثر کافی ترقی کر چکی تھی۔ ۱۸۷۴ء میں نظم جدید کی ابتداء کے ساتھ اردو شاعری ایک نئے دور سے داخل ہوئی۔ افسوس، کہ آج اردو کی سیکڑوں سال کی تاریخ کے روشن صفحات پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ جو عہد اردو کا عہدِ جدید کہا جاتا ہے۔ اس عہد میں ہندی پیدا ہوئی۔ وہ ہندی جو آج راشٹر بھاشا ہے۔

بھارتیندو، ہریش چندر ہندی کے مشہور نثر نگار صحافی اور شاعری تھے۔ وہ ۱۸۵۰ء میں ہوئے اور ۱۸۸۵ء میں ۳۵ سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوا۔ ہندی کا جو روپ ہم دیکھ رہے ہیں۔ وہ ان کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ مہادیر پرساد دویدی کے عہد میں ہندی بہت کچھ نکھر چکی تھی۔ ہندی کا وجود کس قسم کی ذہنیت کا نتیجہ تھا یہ کہنے کی ضرورت نہیں تاریخ گواہ ہے کہ وہ زبان جو اردو کہی جاتی ہے۔ سیکڑوں سال پہلے شمال و دکن، بہار بنگال اور گجرات میں نشو و نما پا چکی تھی۔ سیاسی حالات نے دیوناگری رسم خط میں ایسی اردو لکھنے والوں کو جنم دیا جنہیں عربی و فارسی الفاظ سے دشمنی تھی۔ کوشش کی گئی کہ فارسی و عربی کے عام فہم الفاظ کی جگہ سنسکرت کے غیر مانوس الفاظ کو دے

دی جائے گی۔

بھارتیندو کا زمانہ غدر کے بعد کا زمانہ ہے۔ اس وقت تک ہندی نثر کا چلن ہو چکا تھا۔ ہندی شاعری وجود میں نہیں آئی تھی۔ اب بھی برج کی حکمرانی تھی ــــ بھارتیندو کو یہ بات کھٹکنے لگی تھی کہ شاعری اور نثر نگاری میں دو زبانوں کا استعمال کسی طرح مناسب نہیں۔ یکم دسمبر ۱۸۸۱ء کے ''بھارتیندو متر'' میں بھارتیندو نے کھڑی بولی کے چھند شائع کرائے۔ انہوں نے ایک خط بھی شائع کیا۔ خط کے یہ جملے تو دیکھئے کس قدر ڈرتے ڈرتے بھارتیندو اپنی مجتہدانہ کوشش کا نمونہ پیش کرتے ہیں:

''پرچلت سادھو بھاشا (رائج عوامی زبان) میں کچھ کویتا بھیجی ہے۔ دیکھئے گا کہ اسمیں کیا کسر ہے۔ اور کس اپائے (ترکیب) کے اولمبن (استعمال) کرنے سے اسمیں کاویہ (شاعرانہ حسن) بن سکتا ہے۔ اس سمبندھ (معاملہ) سادھارنتر (عوام) کی سمتی (رائے) گیانت (معلوم) ہونے سے ایسا پریشرم (محنت) کیا جائے گا۔''

دیکھا آپ نے، اس زمانے میں جب کہ اردو سیکڑوں سالوں کی تاریخ بنا چکی تھی۔ ہندی شاعری گھٹنے گھٹنے چل رہی تھی۔ بہت سے لوگ برج کو نظر انداز نہیں کرنا چاہتے تھے۔ برج ہی اصل ہندی سمجھی جاتی تھی۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ اگر برج سے رشتہ ٹوٹ گیا تو ہندی کا نام و نشان ہی مٹ جائے گا۔ ہندی کی تحریک نے بہر حال برج کا نام ونشان تو مٹا ہی دیا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آج برج بھاشا ایک ترقی یافتہ زبان ہوتی۔ میتھلی کو ساہتیہ اکاڈمی نے ایک زبان تسلیم کر لیا ہے۔ برج کم از کم یہ مرتبہ تو ضرور حاصل کر لیتی۔

بھارتیندو کی منظوم تخلیقات ہندی کا ابتدائی نمونہ ہیں ان کے خط کے اقتباس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس دور میں ہندی کا ارتقاء کس طرح ہو رہا تھا۔ بھارتیندو کی چند مکرنیاں دیکھ کر امیر خسرو کی یاد تازہ ہو جاتی ہے:

نئی نت تاں سناوے
اپنے جال میں جگت پھنسا وے

نت نت ہمیں کرے بل سون (۱)
کیوں سکھی سجن، نہیں کانون (قانون)

سب گرو جن کو برا بتاوے اپنی کھچڑی الگ پکاوے
بھیتر تتو نہ (۲) جھوٹی تیجی (تیزی) کیوں سکھی سجن نہیں انگریجی (انگریزی)

جس ہندی شاعری کا یہ ابتدائی نمونہ پیش کیا گیا ہے اس کی عمر ابھی سو سال کی بھی نہ
ہے۔ بھارتیندو کے عہد میں برج کی حمایت کرنے والے کم نہیں تھے وہ سنسکرت آمیز کھڑی بو
میں شاعری کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔

وہ بڑی ذہنی کشمکش میں مبتلا تھے۔ ان کے سامنے صدیوں کے ارتقاء کا نتیجہ کھڑی بولی
وہ نمونہ موجود تھا جسے اردو کہتے ہیں۔ ان کے ذہن سنسکرت آمیز کھڑی بولی قبول کرنے کے
تیار نہیں تھے۔ اردو کا ارتقاء فطری تھا۔ اس زبان کی شیرینی کے مقابلے میں اس جدید زبان
کامیابی مشتبہ تھی ان کا خیال غلط نہ تھا۔ آج بھی اپنی مادری زبان ہندی کہنے والے بہت سے لو
ہندی شاعری کے مقابلے میں اردو شاعری سے زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔ میں چٹخارہ دار غزلو
بات نہیں کہہ رہا ہوں۔ اردو شاعری کے بہترین انتخابات بڑے ذوق وشوق سے پڑھے جا
ہیں۔ یہ مقبولیت اردو ہی کو حاصل ہوئی ہے سنسکرت آمیز ہندی کو نہیں۔

اردو کی مخالفت تاریخی حقائق سے چشم پوشی ہے۔ حقائق سے واقف ہوتے ہوئے
ان کا اعتراف نہیں کیا جاتا، زبردستی کھینچ تان کر کے ہندی کی تاریخ بنانے کی کوشش کی جاتی
دکن کی اردو، شمال کی اردو، امیر خسرو کی شاعری، انشاء کی نثر (رانی کیتکی) اردو کے مختلف رو
ہیں۔ ہندی کے نہیں سور تلسی اور برج و اودھی کے دوسری شاعر برج اور اودھی کے شاعر ہیں ن
ہندی کے ان زبانوں☆ کا ہندی سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ ہندی کو عمر ایک سو پچاس سال سے ز
نہیں۔ ہندی اردو کی ایک دوسری شکل ہے۔ اس کے وجود کی انفرادی حیثیت نہیں ہے۔

---

(۱)، (۲)۔ کمزور، حقیقت۔ مواد

☆ میرا خیال ہے کہ برج اور اودھی کو بولی نہ کہتے ہوئے زبان کہنا چاہیے۔ ان کا سرمایۂ شاعری بڑا جاندار
ان کی شاعری کی تاریخ ہے ہندی کے آغاز نے ان کی ادبی حیثیت ختم کر دی۔

ہندی اردو تنازع کے آخری دس سال

(۱۹۳۷ء تا ۱۹۴۷ء)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

اسی زمانے یعنی اپریل ۱۹۳۹ء سے انجمن ترقی اردو نے اپنے کام کی وسعت اور اس کی اشاعت و تبلیغ کے پیش نظر ''ہماری زبان'' کے نام سے ایک پندرہ روزہ اخبار نکالنا شروع کیا، مولوی عبدالحق لکھتے ہیں کہ

> ''اس زمانے میں ایسے اخبار کی شدید ضرورت تھی۔ ہمارا علمی سہ ماہی رسالہ اس ضرورت کو پورا نہیں کر سکتا تھا۔ ہمیں ضرورت تھی کہ ہم لوگوں کو اپنی زبان کی حقیقت، اس کی ہمہ گیری اور اس کی اہمیت سے آگاہ کریں۔ روزمرہ کے بے جا حملوں سے بچائیں اور اس کی بقاء کی فکر کریں۔ ہمیں اس بات کی بھی ضرورت تھی کہ ارکان انجمن نیز عام طور پر لوگوں کو انجمن کے حالات اور اس کی کارگزاریوں سے آگاہ کرتے رہیں۔ اس کی بھی ضرورت تھی کہ شاخوں کو ایک دوسرے کے حالات اور مشکلات سے واقفیت رہے اور ایک تجربے سے دوسرے فائدہ اُٹھائیں۔ جو علمی کام انجمن میں ہو رہے ہیں یا دوسرے ادارے یا اشخاص انجام دے رہے ہیں ان کی اطلاع دُور و نزدیک پہنچائی جائے۔ انجمن کی مطبوعات کا عام اعلان کیا جائے۔ غرض اپنی کہنے اور دوسروں کی سننے کے لیے

ہمیں کالیداس کے میگھ دوت کی طرح ایک قاصد کی ضرورت
تھی۔ جو اس خدمت کو انجام دے۔''(۱)

اسی زمانے میں مہاتما گاندھی نے زبان کے سلسلے میں ایک اور شوشہ چھوڑا۔ کانگریس نے فیصلہ کیا تھا کہ ہندوستان کی قومی زبان ''ہندوستانی'' ہوگی، گاندھی جی نے ''بھارتیہ ساہتیہ پریشد'' کے جلسے میں اسے ''ہندی ہندوستانی'' کردیا۔ ''ہندی ہندوستانی'' کی وضاحت چاہی گئی تو ہندی اور ہندوستانی کو مترادف بتایا۔ جب اس وضاحت کے خلاف ہر طرف سے آواز بلند ہوئی تو ہندی یا ''ہندی ہندوستانی'' کو چھوڑ پھر ''ہندوستانی'' کی طرف رجوع ہوئے اور اردو والوں کو ایک نئے ڈھب سے فریب دینے کی کوشش کی۔ چنانچہ اس سلسلے میں مولوی عبدالحق اور ڈاکٹر راجندر پرشاد نے ایک معاہدے پر دستخط بھی کیے اور ''ہندوستانی'' کا معیار متعین کرنے کے لیے آل انڈیا ریڈیو، دہلی سے ہندوستانی کے موضوع پر، بعض اکابر مثلاً ڈاکٹر تاراچند، مولوی عبدالحق، بابو راجندر پرشاد، ڈاکٹر ذاکر حسین خاں، پنڈت برجموہن دتاتریا کیفی اور آصف علی سے تقریریں کرائی گئیں جو بعد کو کتابی صورت میں بھی شائع ہوئیں۔(۲) لیکن چونکہ گاندھی جی کی کوئی تجویز، نیک نیتی پر مبنی نہ تھی اس لیے زبان کا مسئلہ سلجھنے کے بجائے روز بروز الجھتا گیا۔ ہندوؤں نے کھلم کھلا کہنا شروع کیا کہ آزادی کے بعد ہندوستان کی قومی زبان ناگری رسم خط میں ہندی ہوگی اور مسلم لیگ نے تکلفات کو چھوڑ کر، واضح طور پر اپنی قراردادوں میں اردو کی پوری حفاظت کرنے اور قومی زبان بنانے کا اعلان کیا۔ غرض کہ ۱۹۳۶ء اور ۱۹۴۷ء کے درمیانی دس برسوں میں ہندی اردو کی لڑائی کئی محاذوں پر لڑی گئی اور اس شدومد کے ساتھ کہ ہندی اور اردو دونوں زبانوں کی تاریخ میں یادگار رہے گی۔

---

(۱) کیفیت روئیداد کل ہند اردو کانفرنس ۱۹۳۹ء، انجمن ترقی اردو دہلی ۱۹۳۹ء، ص ۴۶۔

(۲) ہندوستانی کیا ہے، مکتبۂ جامعہ دہلی، ۱۹۳۹ء

دوسرا حصّہ

مہاتما گاندھی اور بھاشا کا سوال

ڈاکٹر گیان چند

نوٹ: اس لیکھ کی زبان ہندوستانی ہے جسے ہر ہندی والا پوری طرح سمجھ سکتا ہے۔ اس میں باپو کے سارے بول انجمن ترقی اردو ہند کی کتاب مشترکہ زبان کے پہلے ایڈیشن سے لیے گئے ہیں۔

ہمارے نیتاؤں میں صرف مہاتما گاندھی ایسے تھے جنہوں نے زندگی کے ہر پہلو کے بارے میں کچھ نہ کچھ لکھا ہے۔ ان میں سے ایک بڑی گتھی بھاشا کی ہے اور اس پر باپو نے بار بار بڑے خوب صورت ڈھنگ سے اپنے وچار ظاہر کیے ہیں۔ اگر ہم نے ان پر دھیان نہیں دیا تو گھاٹا ہمارا ہوا مہاتما جی جنتا کے آدمی تھے، جنتا کی نبض پر ہاتھ رکھتے تھے اس لیے وہ اسی بھاشا کو قومی بھاشا مانتے تھے جو جنتا کی بول چال کے کام میں لاتی ہو۔ بھاشا کے سائنس کے لحاظ سے بھی بھاشا کا بول چال کا روپ ہی اصلی روپ ہے۔ لکھاوی روپ جھوٹا اور نقلی ہے۔ بھاشا کے سوال پر مہاتما جی کا سب سے پرانا لیکھ ۱۹۰۹ء کے ہند سوراج میں ملتا ہے۔

''سارے ہندوستان کے لیے تو ہندی ہی ہونی چاہیے۔ اسے اردو میں لکھا جائے یا ناگری میں۔ ہندو مسلمانوں کے وچاروں کو ٹھیک رکھنے کے لیے بہت سے ہندوستانیوں کے لیے دونوں لکھاوٹوں کا جاننا ضروری ہے۔ ایسا ہونے پر ہم آپس کے بیوہار میں سے انگریزی کو نکال کر باہر کر سکیں گے۔''

کئی سال بعد انہوں نے ہندی کی یہ تعریف پھر دُہرائی۔

''ہندی بھاشا میں اسے کہتا ہوں جسے اُتر میں ہندو اور مسلمان بولتے ہیں اور جو دیوناگری یا اردو لکھاوٹ میں لکھی جاتی ہے۔''

جو اردو اور ہندی کو دو الگ بھاشائیں کہتے ہیں ان کے لیے مہاتما جی کا جواب یہ تھا کہ اُتری بھارت میں مسلمان اور ہندو دونوں ایک ہی بھاشا بولتے ہیں۔ فرق صرف پڑھے لکھوں نے پیدا کی ہے۔ ۱۹۱۸ء میں مہاتما جی پہلی بار ہندی ساہتیہ سمیلن کے سبھاپتی ہوئی۔ اپنے بھاشن میں آپ نے پھر ہندی کی وہی تعریف کی۔ ۱۹۳۵ء میں آپ دوسری بار سمیلن کے سبھاپتی ہوئے اور اس بار سمیلن سے ہندی کی اپنی تعریف منوالی۔

آپ نے اسے لیکھوں اور بولوں میں نہ صرف اردو اور ہندی بلکہ ہندوستانی کو بھی ایک بھاشا مانا ہے۔

''ہندی، ہندوستانی اور اردو شبد ایک ہی زبان کو ظاہر کرتے ہیں جسے اُتر بھارت میں ہندوستان دونوں بولتے ہیں اور جو دیوناگری یا فارسی لکھاوٹ میں لکھی جاتی ہے۔'' (۱)

''ہندی، ہندوستانی اور اردو یہ تینوں شبد ایک ہی بھاشا کی طرف (۲) اشارہ کرتے ہیں۔''

لیکن اسکے ساتھ ہی مہاتما جی کے ایسے بول بھی بہت کافی ہیں جن میں اردو اور ہندی اور ہندوستانی کو بھی الگ بھاشا کہا گیا ہے۔ مثال کے طور پر

''اگر ہندو اپنے بھائیوں کے نزدیک آنا چاہتے ہیں تو انہیں اردو پڑھنی ہی چاہیے اور ہندو بھائیوں کے نزدیک آنے کی خواہش رکھنے والے مسلمان کو بھی ہندی ضرور سیکھ لینی چاہیے۔'' (۳)

''ہندوستانی کو اصلی شکل دینے کے لیے ہندی اور اردو کو اس کی پالنے والی بھاشائیں سمجھنا چاہیے۔ اس لیے کانگریس کو ان دونوں کی طرف اچھے وچار رکھنے چاہئیں۔''

''کانگریس سے آزاد رہ کر ہندی اور اردو برابر ترقی کرتی رہیں گی۔ ہندی زیادہ تر ہندوؤں میں اور اردو مسلمانوں میں محدود رہے گی۔''

''ایسے بھی کچھ لوگ ہیں جو اس بات کا سپنا دیکھتے ہیں کہ یہاں خالی اردو یا خالی ہندی ہی رہے گی، لیکن میرا خیال ہے کہ یہ ناپاک سپنا ہے اور ہمیشہ ہی رہے گا۔''

۲۷ رجنوری ۱۹۴۶ء کو دکشن بھارت ہندی پرچار سبھا مدراس میں بولتے ہوئے کہا:

''ہندی اور اردو دو ندیاں ہیں اور ہندوستانی ساگر ہے۔ ان دونوں میں سے ہمیں کسی سے نفرت نہیں ہونی چاہیے۔ ہمیں تو دونوں کو اپنانا ہے۔ ہندوستانی کا پیٹ اتنا بڑا ہے کہ وہ دونوں کو اپنا لے گی۔''

آپ یہ سن کر تعجب کریں گے کہ یہ دونوں باتیں سچ ہیں۔ اگر بول چال کے روپ کو سامنے رکھیں تو اردو، ہندی اور ہندوستانی ایک بھاشا ہیں۔ اگر ان کا لکھا ہوا روپ اور ساہتیہ دیکھیں تو اردو اور ہندی الگ الگ زبانیں ہیں۔

اسی طرح ان کے لیکھوں میں ایک طرف بہت سے ایسے ٹکڑے مل جائیں گے جہاں انہوں نے زور دیا ہے کہ اردو صرف مسلمانوں کی اور ہندی صرف ہندوؤں کی بھاشا نہیں مثلاً

''ہندی بولنے والے حصوں میں پیدا ہونے والے مسلمانوں کی مادری زبان ہندی ہی ہے اسی طرح ایسے ہزاروں ہندو ہیں جن کی ماتر بھاشا اردو ہے۔''(۵)

دوسری طرح کئی بار وہ اردو بھاشا اور لپی کو مسلمانوں سے اور ہندی بھاشا اور دیوناگری کو ہندوؤں سے جوڑ دیتے ہیں۔ نمونے کے طور پر:

''اگر ہندو اپنے بھائیوں کے نزدیک آنا چاہتے ہیں تو انہیں اردو پڑھنی ہی چاہیے او ہندو بھائیوں کے نزدیک آنے کی خواہش رکھنے والے مسلمان کو بھی ہندی ضرور سیکھ لینی چاہیے۔''(۶)

یہ دونوں باتیں انمیل ہیں، لیکن گہرائی میں جا کر دیکھا جائے تو دونوں اپنی اپنی جگہ سچ ہیں۔ اردو پڑھنے والے زیادہ تر مسلمان اور ہندی پڑھنے والے ہندو ہوتے ہیں، لیکن سب مسلمانوں کی بھاشا اردو ہی نہیں ہوتی اور کچھ ہندو ہندی نہ پڑھ کر اردو پڑھتے ہیں۔

مہاتما جی سچ مچ ہندی اور ہندوستانی میں کوئی فرق نہ کرتے تھے۔ ۱۹۲۱ء سے انہوں نے عام طور پر قومی زبان کو ہندوستانی کہنا شروع کیا۔ چناں چہ ان کے اشارے پر ۱۹۲۵ء میں کانپور کانگریس نے اپنے ودھان کو دفعہ ۳۳ یہ کر دی کہ آئندہ سے کانگریس کی شاخوں اور ورکنگ کمیٹی کا کام ہندوستان میں کیا جائے گا۔ جو بولنے والے ہندوستانی نہیں بول سکتے وہ انگریزی یا کسی صوبائی بھاشا کا استعمال کر سکتے ہیں۔

مہاتما جی نے بھاشا کی پوری اسکیم ۱۹۲۴ء کے ایک لیکھ میں یوں دی ہے۔

''ایک خاص معیاد کے اندر ہر صوبے کی عدالتوں اور اسمبلیوں کا کام کاج اسی صوبے کی بھاشا میں جاری ہو جانا چاہیے۔ اپیل کی آخری عدالت کی زبان ہندوستانی قرار دی جائے۔ لکھاوٹ چاہے دیوناگری ہو چاہے فارسی۔ مرکزی سرکار اور بڑی اسمبلیوں کی بھاشا بھی ہندوستانی ہی ہو انتر راشٹری راج بیوہار کی زبان انگریزی رہے۔''(۷)

مہاتماجی نے آدرش وادی کی طرح یہ سب لکھ دیا ہے۔ ان باتوں پر عمل کرنے میں جو مشکلیں ہیں ۱۹۲۴ء میں ان کا اندازہ مہاتما گاندھی کے لیے مشکل تھا۔ آج ہم سب کو معلوم ہے۔ مثال کے طور پر ہائی کورٹوں کا کام صوبائی بھاشاؤں میں ہوا اور سپریم کورٹ کا ہندوستانی میں تو قانون اور انصاف کے ڈھانچے کے ٹکڑے ہو جائیں گے۔ پھر ہندوستانی میں یہ جان کہاں کہ وہ سپریم کورٹ، پارلیمنٹ اور دِتّی سرکار کی بھاشا بن سکے۔ اس ذمہ داری کو اُٹھاتے تو خالص ہندی یا خالص اردو بھی لنگڑانے لگتی ہیں۔ بہر حال ۱۹۲۴ء میں ایک موٹے اُصول بلکہ آدرش کے روپ میں یہ مانگیں سراہنے کے لائق ہیں۔

ہندوستانی اور دکھنی ہندوالے۔ ہندی یا ہندوستانی کو قومی زبان بنانے سے اصل دقت دراوڑ صوبوں کے رہنے والوں کو ہوتی۔ ان سے مہاتماجی نے بار بار اپیل کی کہ باقی دیش واسیوں کی خاطر ہندی سیکھ لیں۔ لکھتے ہیں:

''ساڑھے اکتیس کروڑ کی آبادی میں صرف ۳ کروڑ ۸۰ لاکھ سے کچھ اوپر مدراسی لوگ ہندوستانی بولنے والوں کی بات تو سمجھ نہیں سکتے۔ اس علاقے کے ۳۸۰ لاکھ لوگوں کا دھرم کیا ہے کیا ان کے لیے ہندوستان انگریزی سیکھے یا پھر باقی ۲۷۷ لاکھ ہندوستانیوں کے لیے انہیں ہندوستانی سیکھنی چاہیے۔'' (۸)

بنگلور میں ۱۹۳۵ء میں ہندی پرچار سبھا کے کنووکیشن میں کہا۔

''بھارت کے بیس کروڑ آدمیوں سے تعلق پیدا کرنے کے لیے کرناٹک کے ایک کروڑ دس لاکھ نرناریوں کو ان کی بھاشا ہندی سیکھنی چاہیے۔''

۵ر جولائی ۱۹۴۶ء کے ہریجن میں مہاتماجی نے پھر کرناٹک والوں سے اپیل کی کہ بیس کروڑ دیش بھائیوں کے ساتھ سمبندھ قائم کرنے کے لیے ہندی سیکھیں۔''

مہاتماجی کی ہندوستانی میں بڑی لچک تھی۔ وہ سنسکرت بھری ہندی اور عربی فارسی بھری اردو کے خلاف تھے، لیکن یہ مانتے تھے کہ کبھی کبھی ہندوستانی میں سنسکرت یا عربی فارسی میں سے کسی ایک کا زور ہو سکتا ہے۔ چنانچہ دکھن والوں کے لیے ہندوستانی میں سنسکرت شبد ہونے ہی چاہئیں۔ لکھتے ہیں:

''اگر سنسکرت جاننے والے ہندو سنسکرت شبدوں کا ایک حد تک استعمال کرتے ہیں تو ان کا ایسا کرنا ضروری ہے۔ صرف عربی جاننے والے بھی یہی کرتے ہیں۔ تامل یا تیلگو کی کسی چیز کا

ترجمہ آپ ہندی یا ہندوستانی میں کریں اور اس میں سنسکرت شبد نہ آئیں یہ نہیں ہو سکتا۔ ان کا آنا قریب قریب لازمی ہے کیوں کہ ان میں سنسکرت شبد بہت زیادہ ہیں۔ یہی حال عربی لفظوں کا ہے۔ عربی کی کسی چیز کا ترجمہ اگر ہم ہندی یا ہندوستانی میں کرنے بیٹھیں تو اس میں عربی شبدوں کو آنے سے ہم روک نہیں سکتے۔" (۹)

مہاتما جی نے ۱۹۳۷ء اور ۱۹۳۸ء میں یہ رائے ظاہر کی کہ چوں کہ دکھن کی بھاشاؤں اور بنگالی میں سنسکرت شبد زیادہ ہیں اس لیے سنسکرت شبدوں سے بھری ہوئی ہندی ہی ان لوگوں کو اپیل کر سکتی ہے۔ اسی طرح جیسے پنجاب والوں کی ہندوستانی میں عربی فارسی شبدوں کی ملاوٹ ہوگی۔

یہاں تک تو ٹھیک تھا، لیکن مہاتما جی نے یہ غضب کیا کہ صوبائی بھاشاؤں والوں کو بار بار یہ صلاح دی کہ وہ اپنی بھاشا دیوناگری میں لکھنے لگیں۔ ۱۹۳۵ء میں بنگلور کے ہندی پرچار کنووکیشن میں مہاتما جی نے کرناٹک والوں پر زور دیا کہ وہ ہندی سیکھ لیں۔ اس پر وہاں کے ایک شخص نے بگڑ کر لکھا۔

> "تامل والا تامل کی جگہ انگریزی میں سوچتا ہے۔ آپ کی یوجنا کے بعد وہ ہندی میں سوچنے لگے گا۔ اس طرح اس نیتی کا صاف نتیجہ یہ ہی ہو سکتا ہے کہ اور ساری بھاشائیں مٹ جائیں اور صرف ہندی رہ جائے وہ بھی دونوں لکھاوٹوں میں کیونکہ سب بھاشاؤں کی لکھاوٹ تو دیوناگری ہی ہو جائے گی۔"

اس پر مہاتما جی نے جواب دیا:

"اگر پورا راشٹر اپنی بھاشا کے سوا ایک کل بھارتی بھاشا جان لے تو کیا حرج ہے۔ یہ بھاشا ہندی یعنی ہندوستانی ہی ہو سکتی ہے۔ رہا ماتری بھاشا کا سوال تو آپ مجھے غلط سمجھے ہیں۔ ماتری بھاشا کو پہلی جگہ دیتا ہوں۔ ہاں لپی کے بارے میں مجھے اپنی رائے پر پچھتاوا نہیں ہے۔ جو الگ الگ بھاشائیں سنسکرت سے نکلی ہیں یا جن کے ساتھ اس کا گہرا رشتہ رہا ہے پر جُدا جُدا لکھاوٹوں میں لکھی جاتی ہیں۔ ان کی ایک ہی لپی ہونی چاہیے اور وہ لکھاوٹ دیوناگری ہی ہے۔" (۱۰)

اس کے بعد بھی مہاتما جی صوبائی بھاشاؤں کے لیے دیوناگری کی وکالت کرتے رہے، لکھتے ہیں:

''اس میں شک نہیں کہ دیوناگری لکھاوٹ کا ایک آندولن چل رہا ہے جس کا ساتھ میں دل سے دے رہا ہوں اور وہ یہ ہے کہ مختلف صوبوں میں خاص کر جن صوبوں میں سنسکرت شبدوں کا بہت زیادہ استعمال ہوتا ہے بولی جانے والی تمام بھاشاؤں کے لیے دیوناگری لکھاوٹ کو مان لیا جائے۔

''رومن لکھاوٹ نہ تو ہندوستان کی زبان ہو سکتی ہے اور نہ ہونی چاہیے۔ یہ برابری تو فارسی اور دیوناگری کے بیچ ہی ہو سکتی ہے اور اس کی بنیادی خوبیوں کو الگ رکھ دیں تو بھی دیوناگری ہی سارے ہندوستان کی سب کو منظور لکھاوٹ ہونی چاہیے کیوں کہ مختلف صوبوں میں چالو زیادہ تر لکھاوٹیں بنیادی طور سے دیوناگری ہی سے نکلی ہیں۔۔۔ لیکن اس کے ساتھ ہی مسلمانوں پر یا دوسرے ایسے لوگوں پر جو اس سے انجان ہیں اسے زبردستی لادنے کی ہمیں کسی طرح کی کوئی خواہش نہیں کرنی چاہیے۔'' (۱۲)

مہاتما جی کی یہ بات سمجھ نہیں آتی کہ تمام صوبائی بھاشائیں تو دیوناگری میں لکھی جائیں لیکن خود ہندی، دیوناگری اور اردو دونوں میں لکھی جائے۔ ایسا کچھ شبہ کسی اُتر بھارت والے کے دل میں اُٹھا اور اس نے مہاتما جی سے کئی سوال کیے جن کا جواب ۲۶ر اپریل ۱۹۴۲ء کے ہریجن سیوک میں ملتا ہے۔ سوال کرنے والے نے کہا تھا کہ

''اگر آپ ہندو مسلم ایکتا کے لیے اردو سیکھنے کو کہتے ہیں تو بنگال، مہاراشٹر، گجرات، دکھنی بھارت وغیرہ کے مسلمان تو اردو نہیں جانتے، صوبائی بھاشائیں بولتے ہیں۔ اُتر بھارت کی تمام بھاشائیں سنسکرت سے نکلی ہیں اور دکھنی بھارت کی بھاشاؤں میں سنسکرت شبد آ گئے ہیں پھر ان میں عربی فارسی جیسی اجنبی زبانوں کے شبدوں کا پرچار کیوں کیا جائے؟''

دوسرا سوال لپی کے بارے میں تھا کہ زیادہ تر صوبوں کی لپیاں دیوناگری سے نکلی ہیں۔ صرف پنجاب اور سندھ والے ناگری کیوں نہیں سیکھ لیتے۔ باقی لوگوں سے اردو لپی سیکھنے کو کیوں کہا جاتا ہے۔ مہاتما جی نے جواب دیا آپ کی بات میں بہت سچائی ہے لیکن ہندو مسلم ایکتا کے لیے ایسا کرنا ضروری ہے۔ اگر دوسرے صوبوں والے دیش پریم کے ساتھ لپی اردو سیکھ لیں تو ان کا فائدہ ہی ہے۔

مہاتما جی اور انگریزی: آگے بڑھنے سے پہلے ہم انگریزی کے لیے مہاتما جی کے وچار جانتے چلیں۔ وہ ۱۹۰۹ء سے کہتے چلے آئے ہیں کہ ہمیں انگریزی کو نکال باہر کرنا ہے۔ ودیشی بھاشا ہمیں آزادی نہیں دلا سکتی، لیکن انگریزی کی کوئی جگہ ہونی چاہیے یا نہیں۔ اس کی طرف بھی انہوں نے اشارہ کیا ہے۔ اندور میں 1918ء میں کہا:

''یہ کہنا ضروری نہیں ہے کہ میں انگریزی بھاشا سے نفرت نہیں کرتا ہوں۔ انگریزی ساہتیہ بھنڈار ہے۔ میں نے بہت سے رتنوں کا استعمال کیا ہے۔ انگریزی بھاشا کے ذریعے ہم کو سائنس وغیرہ کی خوب جان کاری حاصل کرنی ہے۔ اس لیے انگریزی کی جانکاری بھارت واسیوں کے لیے ضروری ہے، لیکن اس بھاشا کو اس کی ٹھیک ٹھیک جگہ دینا ایک بات ہے اس کی پوجا کرنا دوسری بات ہے۔''

۱۹۲۴ء میں بھاشا سے متعلق مہاتما جی نے اپنی پوری اسکیم کھل کر بیان کی۔ اس کا ذکر پیچھے آ چکا ہے۔ اس میں انگریزی کو صرف دوسرے ملکوں سے کام کاج کے لیے باقی رکھا ہے ملک کے اندر کوئی جگہ نہیں دی۔ یہ ٹھیک نہیں معلوم ہوتا۔ ۱۹۲۷ء میں جھریا میں کوئلے کی کانوں کے مزدوروں کی طرف سے مہاتما جی کو انگریزی میں ایک ایڈریس دیا گیا۔ آپ نے اسے سننے سے انکار کر دیا اور اسے پڑھے بغیر ہی پڑھا ہوا مان لیا گیا۔ ۲۰/ جنوری ۱۹۲۷ء کو نوجیون میں مہاتما جی نے یہ اُمید ظاہر کی ہے کہ آئندہ کسی سبھا کی کاروائی کسی ایسی بھاشا میں ہو جسے زیادہ لوگ جانتے ہوں تو اچھا ہوگا کہ وہ لوگ اس سبھا سے اُٹھ کر چل دیں۔ ظاہر ہے کہ باپو کا اشارہ انگریزی کی طرف تھا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مہاتما جی پڑھے لکھوں کے لیے انگریزی جاننا ضروری نہ سمجھتے تھے۔ صرف کچھ لوگ انگریزی پڑھ لیں اسے کافی مانتے تھے۔ ہریجن میں لکھتے ہیں:

''میں نے بار بار یہ سمجھایا ہے کہ ہماری ترقی میں انگریزی کی ایک مقرر جگہ ہے۔ ہمارے راجیوں کی اور ساری پچھمی دنیا کی بات سمجھنے کے لیے اور پچھم کی اچھی سے اچھی باتیں ہندوستانی کو سکھانے کے لیے ہمارے کچھ آدمیوں کو انگریزی ضرور سیکھنی چاہیے۔ کیوں کہ پچھمی بھاشاؤں میں اس کا سب سے زیادہ پرچار ہے۔'' (۱۳)

اس لیکھ میں انگریزی کو راجیوں کی باتیں سمجھنے کا ذریعہ بھی قرار دیا گیا ہے۔ راجیوں سے مطلب صوبے ہی ہو سکتے ہیں۔ صرف اس لیکھ کے سوا اور کہیں یہ دیکھنے میں نہیں آیا کہ مہاتما

جی نے صوبوں کے بیچ میل جول کے لیے انگریزی کو ضروری سمجھا ہو۔ سچ یہ ہے کہ مہاتما جی انگریزی کو دیس کی ترقی کے راستے میں روڑا سمجھتے تھے۔ ایک جگہ انگریزی سیکھنے کو وقت برباد کرنا کہہ گئے ہیں۔

''انگریزی زبان نے ہم پر جو جادو کر ڈالا ہے۔ اسکے اثر سے ہم ابھی تک چھوٹے نہیں ہیں۔ اس جادو کے جال میں پھنس کر ہم لوگ ہندوستان کو اپنے مقصد کی طرف آگے بڑھنے سے روک رہے ہیں۔ جتنے سال ہم انگریزی سیکھنے میں برباد کرتے ہیں اگر اتنے مہینے بھی ہم ہندوستانی سیکھنے کی تکلیف نہ اُٹھائیں تو سچ مچ ہی کہنا ہوگا کہ ہم عام لوگ کی طرف اپنے پریم کی جو ڈینگیں ہانکا کرتے ہیں وہ نری ڈینگیں ہی ہیں۔''

(رچناتک کاریہ کرم)

آج تعلیم کے ماہر عام طور پر مانتے ہیں کہ ہندوستان میں ہر پڑھے لکھے کو انگریزی ضرور پڑھنی چاہیے۔

مہاتما جی اور اردو: مہاتما جی نے سب سے زیادہ حمایت اردو کی کی، لیکن دُکھ کی بات ہے کہ ان کی سب سے زیادہ مخالفت اردو والوں نے ہی کی۔ یہ ایک سچائی ہے کہ آزادی سے پہلے کی اردو تحریک مسلم لیگ کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔ مہاتما جی اردو کے پریمی تھے، لیکن اپنی کچھ گول مال باتوں سے انہوں نے اردو والوں کے من میں شک پیدا کر دیا۔ ۱۹۳۵ء میں اندور میں ہندی ساہتیہ سمیلن میں انہوں نے اکھل بھارتیہ ساہتیہ پریشد بنانے کا سجھاؤ دیا جس کا مقصد صوبائی بھاشاؤں اور ان کے ساہتیہ کاروں میں میل جول پیدا کرنا تھا۔ اس پریشد کی بیٹھک ۲۴/اپریل ۳۶ء کو ناگپور میں ہوئی۔ پہلے ہی جلسے میں یہ پرستاؤ رکھا گیا کہ اس سبھا کا کام ''ہندی ہندوستانی'' میں ہوگا۔ اس پر مولوی عبدالحق نے سخت اعتراض کیا کہ جب کانگریس نے ''ہندوستانی'' کو ملک کی زبان طے کیا ہے تو یہ ہندی ہندوستانی کیا ہے۔ مہاتما جی نہ مانے۔ اسے بدل کر ''ہندی اتھوا ہندوستانی'' کرنے پر تیار ہو گئے۔ مولوی عبدالحق نے تجویز کی کہ ''ہندی ہندوستانی'' کی بجائے صرف ''ہندوستانی'' یا پھر ''ہندی یا اردو'' کر دیا جائے۔ ان کی بات نہ مانی گئی اور وہ پریشد چھوڑ کر چل دیے۔ اردو والوں میں مشہور ہے کہ اس موقع پر مہاتما جی نے کہا تھا۔

''اردو زبان مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے۔ قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے اور مسلمان بادشاہوں نے اسے بنایا اور پھیلایا۔ مسلمان چاہیں تو اسے رکھیں اور پھیلائیں۔'' (۱۴)

یقین نہیں آتا کہ مہاتما جی نے ایسا کہا ہوگا۔ اردو اور مسلمانوں کا کوئی مخالف بھی اس سے زیادہ کیا کہتا۔ باپو اردو کے پریمی تھے، لیکن جنوری ۱۹۴۲ء میں کسی اردو والے نے مہاتما جی کو چٹھی لکھی جس میں دوسری باتوں کے سوا یہ بھی لکھا تھا۔

''آپ تو اردو کو کھلم کھلا فارسی لکھاوٹ میں لکھی جانے والی مسلمانوں کی بھاشا کہہ چکے ہیں۔ آپ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ اگر مسلمان چاہیں تو بھلے ہی اس کی حفاظت کریں۔''

مہاتما جی نے یہ چٹھی اور اس کا جواب ۸/فروری ۱۹۴۲ء کے ہریجن سیوک میں چھاپا ہے جہاں انہوں نے چٹھی کی دوسری غلط فہمیوں کو دُور کیا ہے۔ اوپر دی ہوئی بات کا کاٹ نہیں کیا، اس سے انکار نہیں کیا۔ ۸/جنوری ۱۹۶۰ء کے ''ہماری زبان'' میں اس کے ایڈیٹر پروفیسر آل احمد سرور نے ایک ایڈیٹوریل لکھا ''کیا اردو مسلمانوں کی زبان ہے'' اس میں اوپر لکھی ہوئی بات کو سچ مچ مہاتما گاندھی کی رائے سمجھ کر لکھا۔

''اردو ہندو مسلم اتحاد کی یادگار اور ہماری مشترک قومی تہذیب کی نشانی ہے۔ اس کی اس حیثیت کو لاکھ لوگ فراموش کریں یہ حیثیت برقرار رہے گی چاہے بقول گاندھی جی کے قرآن کے حروف میں لکھی جائے، چاہے مسلمانوں کا بیشتر مذہبی اور تہذیبی سرمایہ اس میں موجود ہو ہندوستان کے بیشتر مذاہب کے ماننے والوں کی زبان رہی ہے اور ہے۔''

اس پر مشہور گاندھی وادی ڈاکٹر جعفر حسین نے ۲۲/اپریل ۱۹۶۰ء کے ''ہماری زبان'' میں ایڈیٹر کو چٹھی لکھی جس میں اس بات کو لے کر اپنی اور باپو کی پوری چٹھی پتری دی ہے۔ ڈاکٹر جعفر حسین صاحب کہتے ہیں کہ ہمیشہ یہ بات کھٹکتی تھی کہ مہاتما جی جیسی ہستی ایسی جاہلوں والی اور دل دُکھانے والی بات کیسے کہہ سکتی تھی۔ ڈاکٹر جعفر حسین نے ۱۵/ستمبر ۱۹۴۱ء کو مہاتما جی کو لکھ کر پوچھا کہ آپ کے نام سے یہ بول ان گنت بار نقل کیے جاتے ہیں۔ کیا آپ نے واقعی ایسا کہا تھا اور اب آپ کی کیا رائے ہے۔

مہاتما جی نے ۲۹/ستمبر ۱۹۴۱ء کو جواب دیا کہ میں نے وہ جملے کبھی نہیں کہے۔ تم وہ کوٹیشن بھیجو جس میں یہ بات مجھ سے جوڑی گئی ہے۔ میں نے خود اردو سیکھی ہے اور مولانا شبلی کی سیرت النبی اور اردو کی دوسری تحریریں پڑھی ہیں۔

ڈاکٹر جعفر حسین نے کچھ کوٹیشن بھیجے۔ اس کے بعد ایک مرتبہ ان کا مہاتما جی سے ملنا ہوا۔ تو باپو کو بتایا کہ یہ بات آپ نے مولوی عبدالحق کے سامنے ناگپور میں کسی بھرے جلسے میں کہی

تھی۔ اس وقت مہاتما جی نے کچھ نہیں کہا لیکن بعد میں ۳ر اپریل ۱۹۴۲ء کو بردولی سے لکھا۔

''میرا ایڈریس لکھا ہوا تھا۔ میرے ریمارک اسی طرح کے ہو سکتے تھے جس طرح کا وہ ایڈریس تھا۔ اس میں کوئی ایسی بات نہیں جو مولانا صاحب کے اعتراض کو ٹھیک قرار دیے۔''

اوپر دی ہوئی ساری چٹھی پتری ۲۲ر اپریل ۱۹۶۰ء کے ''ہماری زبان'' میں دیکھی جا سکتی ہے۔ اس کے بعد طے ہو جاتا ہے کہ مہاتما جی نے یہ بات نہیں کہی تھی۔ مولوی عبدالحق کو یا تو سمجھنے میں بھول ہوئی یا انہیں غلط یاد رہ گیا۔

یہ جھوٹ سہی، لیکن ''ہندی ہندوستانی'' کی بات اردو والوں کے لیے ایسی ثابت ہوئی جیسے پاگل سانڈ کے لیے لال چیتھڑا۔ مولوی عبدالحق نے اردو کے لیے ایک زبردست آندولن شروع کیا اور کہا کہ بھارتیہ ساہتیہ پریشد اردو کو ختم کرنے اور ہندی کو لادنے کی ایک زبردست سازش ہے۔

مہاتما جی نے ۱۶ر مئی ۱۹۳۶ء کے ''ہریجن''، میں ''ہندی ہندوستانی'' نام کے لیکھ میں لکھا کہ بھارتیہ ساہتیہ پریشد، ہندی ساہتیہ سمیلن کی پیداوار ہے۔ ۲۵ برس کی پرانی سنستھا سے میں نام بدلنے کو کہوں تو یہ گستاخی ہوگی۔ اگر کسی کو ہندی نام سے چڑھ ہے تو اُسے جاننا چاہیے کہ ''ہندی'' مسلمانوں کا دیا ہوا نام ہے۔

مہاتما جی نے ایک اور لیکھ (۱۵) میں اس بات پر دُکھ ظاہر کیا کہ سمیلن نے ہندی کی تعریف میں اردو لکھاوٹ کو ظاہر کر کے جو بڑا قدم اُٹھایا ہے مسلمانوں نے اس کو بہتر سراہا۔

۳۷ء میں بابو راجندر پرشاد اور مولوی عبدالحق میں ایک سمجھوتہ ہوا جس میں یہ طے پایا کہ اردو ہندی کے قابل لوگ مل کر ایک ڈکشنری بنائیں۔ ہندی کے لیکھکوں نے جو اردو شبد اور اردو کے لیکھکوں نے جو ہندی شبد استعمال کیے ہیں وہ سب اس ڈکشنری میں جمع کیے جائیں اور یہ ہندوستانی بھاشا کا شبد بھنڈار مانا جائے گا۔ مہاتما جی نے اس سمجھوتے کو بہت سراہا، لیکن معلوم نہیں کیوں اس کا کام آگے نہ بڑھا۔ آخرکار ۱۹۳۸ء تک مہاتما جی کا پکا وچار ہو گیا کہ راشٹر بھاشا کا نام صرف ہندوستانی ہو۔ انہوں نے کانگریسیوں کو رائے دی کہ راشٹر بھاشا کا ذکر کرتے وقت وہ اردو یا ہندی نہ کہہ کر ہندوستانی ہی کہا کریں۔ عجیب بات ہے ۵ر جولائی ۱۹۴۶ء کے ہریجن میں انہوں نے دکھن والوں کو ''ہندی ہندوستانی'' سیکھنے کی رائے دی۔

۲ رمئی ۱۹۴۲ء کو مہاتما جی نے واردھا میں ہندوستانی پرچار سبھا بنائی، لیکن دو چار مہینے بعد ہی ''بھارت چھوڑو آندولن'' کے سلسلے میں پکڑے گئے اور کام رُک گیا۔ ۱۹۴۴ء، ۱۹۴۵ء میں یہ کام پھر سے چالو ہوا۔ مہاتما جی ڈاکٹر تاراچند کی یہ بات مانتے تھے کہ شروع میں اُتری بھارت میں ایک بھاشا تھی جسے ہندو مسلمان دونوں بولتے تھے۔ جو ایک تھی وہ دو ہو گئی۔ ہندوستانی پرچار سبھا کا کام اُن دونوں کو پھر سے ایک بنانا ہے۔ ۲۷ فروری ۱۹۴۵ء کو آپ نے مولوی عبدالحق کو واردھا بلایا اور کہا۔

''عبدالحق صاحب نے ناگپور میں جو بات کہی تھی اسے اس وقت میں نہ سمجھ سکا۔'' ''ہندی یعنی اردو'' اسے میں نے مانا نہیں تھا۔ اس وقت ان کی بات مان لیتا تو اچھا ہوتا۔۔۔ ناگپور میں بھارتی ساہتیہ سمیلن کیا تھا، لیکن وہ وہیں شروع ہوا اور وہیں ختم ہوا۔ ہم لوگ ملنے آئے تھے اور پھر الگ الگ ہو گئے۔ ایسے سمیلن سے کیا فائدہ ہو سکتا تھا وہ ہندوستانی نہیں بلکہ بھارتی ساہتیہ سمیلن تھا۔''

ہمیں معلوم نہیں کہ ہندی ساہتیہ سمیلن نے ہندی کی اپنی تعریف بدل دی تھی یا کچھ اور بات تھی کہ مہاتما جی نے ساہتیہ سمیلن کی ممبری سے استعفیٰ دینے کی بات سوچی۔ سمیلن کے سبھا پتی پرشوتم داس ٹنڈن اور مہاتما جی کے بیچ چٹھی پتری ہوئی۔ ٹنڈن جی مہاتما جی کے بہت بڑی بھگت تھے، لیکن انہوں نے لکھا کہ میں آپ کے وچار سے ہر ایک دیش واسی ہندی اور اردو دونوں سیکھے۔ اتفاق نہیں کرتا۔ آخر ۱۵/ جولائی ۱۹۴۵ء کو مہاتما جی نے سمیلن چھوڑ دیا۔

جون ۱۹۴۷ء میں جب ملک کے بٹوارے کا فیصلہ ہو گیا تب بھی مہاتما جی اپنی بات پر اَٹل رہے۔ اعتراض کیا گیا کہ جب پاکستان ایک حقیقت بن گیا ہے تو ہندوستانی زبان کو ہندی اور اردو لکھاوٹوں میں پھیلانے کی کوشش ریت کی رسی بٹنا ہے اور پاگل پن ہے، لیکن مہاتما جی اپنے وشواس پر قائم رہے۔ جب انہیں بتایا گیا کہ قومی زبان ہندی ہو گی جو دیوناگری میں لکھی جائے گی تو انہوں نے کہا کہ میں اس پر کبھی رضامند نہیں ہو سکتا۔

ہریجن ۲ راگست ۱۹۴۷ء

۱۵ راکتوبر ۱۹۴۷ء کو دہلی ڈائری میں لکھتے ہیں:

''میں نے اخباروں میں ایک پیراگراف دیکھا ہے کہ آئندہ سے یو پی کی سرکاری زبان ہندی، دیوناگری لپی کے ساتھ ہو گی۔ اسے سے مجھے دُکھ ہوا۔ ہندو مسلمان میں برابر کے

سلوک کا تقاضا یہ ہے کہ اردو لپی کو بھی باقی رکھا جائے۔ ایک ایسا ملک نہ بنانا چاہیے جہاں مسلمانوں کے لیے عزت کی زندگی ناممکن ہو جائے۔''

۱۸؍اکتوبر کو لکھتے ہیں:

''ہماری قوم پرستی اگر دونوں لپیوں کے سیکھنے سے گھبراتی ہے تو وہ بہت گھٹیا قسم کی قوم پرستی ہے۔''

بھاشا کے بارے میں ان کے آخری بول ۱۸؍دسمبر ۱۹۴۷ء کو ملتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

''کیا اردو اور ہندی کو ملا کر ایک زبان بنانے کی کوشش کر کے میں کمتر درجے کا ہندو یا ہندوستانی ہو گیا۔ کیا وہ ایک اَکھل بھارتی بھاشا کی سیوا کر سکتے ہیں۔ اگر اردو لپی اور بھاشا کو اس سے نکال دیا جائے۔ میں ہمیشہ تو تمہارے پاس رہوں گا نہیں، مگر تم میرے رخصت ہو جانے کے بعد میرے شبدوں کو یاد کرو گے۔''

اور اگلے مہینے میں وہ رخصت ہو گئے۔ انہیں کے ساتھ ہندوستانی بھی مر گئی۔ یہ مانا کہ آج بھاشا کی گتھی بہت الجھ گئی ہے اور اردو، ہندی، ہندوستانی کا سوال نہیں رہا۔ اب ہندی اور تامل، ہندی اور بنگالی، ہندی اور انگریزی کا سوال ہے۔ پھر بھی ملک کی عام آپسی بول چال کی بھاشا کے بارے میں سوچا جائے تو باپو کے وچار آج بھی سولہ آنے کھرے دکھائی دیتے ہیں۔ یو پی، بمبئی، آندھرا اور کشمیر وغیرہ کے بازاروں میں جس بھاشا سے ہم اپنا کام چلاتے ہیں اسے ہندی کہنا بھی جھوٹ ہے اور اردو کہنا بھی غلط۔ وہ ہندوستانی ہے۔ بھاشا شاستر کے قاعدے سے اردو ہندی کی تقسیم بالکل جھوٹی اور بے بنیاد ہے۔ بول چال کی بھاشا ایک اور ساہتیہ کی بھاشائیں دو۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ کسی طرح انہیں سمو کر ایک کر دیا جائے۔

آج ہمارے دیش کی بھاشائی گتھی سلجھانے کے لیے باپو کی کتنی ضرورت ہے۔

○○○

حوالہ جات

۱۔ ہریجن سیوک، ۳/جولائی ۱۹۳۷ء۔

۲۔ ہریجن، ۵/جولائی ۱۹۴۶ء۔

۳۔ نوجیون، ۲۱/جولائی ۱۹۲۷ء۔

۴۔ ہریجن سیوک، ۲۹/اکتوبر ۱۹۳۸ء۔

۵۔ ہریجن سیوک، ۲۹/اکتوبر ۱۹۳۸ء۔

۶۔ نوجیون، ۲۱/جولائی ۱۹۲۷ء۔

۷۔ نوجیون، ۲۶/دسمبر ۱۹۲۴ء۔

۸۔ ینگ انڈیا، ۲۱/جنوری ۱۹۲۱ء۔

۹۔ ہریجن سیوک، ۲۳/جون ۱۹۳۶ء۔

۱۰۔ ہریجن، ۱۵/اگست ۱۹۳۵ء۔

۱۱۔ ہریجن سیوک، ۲۳/جون ۱۹۳۶ء۔

۱۲۔ ایضاً ۳/جولائی ۱۹۳۷ء۔

۱۳۔ ہریجن، ۱۵/اگست ۱۹۳۵ء۔

۱۴۔ پنجاہ سالہ تاریخ ترقی اردو، ص ۶۲۔

۱۵۔ ہریجن سیوک، ۲۹/اکتوبر ۱۹۳۸ء

ooo

ہندوستانی، ہندی اور اردو

موہن داس کرم چند گاندھی

بڑے افسوس کی بات ہے کہ ہندی اردو سوال پر تلخ بحث مباحثہ ہوا ہے اور اب بھی ہو رہا ہے۔ جہاں تک کانگریس کا تعلق ہے "ہندوستانی" اس کی منظور کی ہوئی سرکاری زبان ہے جسے بین صوبائی تبادلۂ خیال کے لیے ایک کل ہند زبان بنانا مقصود ہے۔ یہ صوبائی زبانوں کی جگہ نہیں لے گی بلکہ ان کی امداد کرتی رہے گی۔ ورکنگ کمیٹی کے حال کے رزولیوشن سے تمام شک دور ہو جانے چاہئیں۔ کانگریس کے جن آدمیوں کو کل ہند پیمانے پر سیوا کرنی پڑتی ہے۔ اگر وہ صرف اتنی زحمت کریں کہ دونوں لکھاوٹوں میں ہندوستانی زبان سیکھ لیں تو گویا اپنے مشترکہ زبان کے مقصد کی طرف کئی منزلیں طے کرلیں گے۔ اصل مقابلہ ہندی اور اردو میں نہیں بلکہ ہندوستانی اور انگریزی میں ہے۔ یہ مقابلہ سخت ہے اور میں اسے یقیناً بڑی تشویش کے ساتھ دیکھ رہا ہوں۔ ہندی اردو بحث کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔ کانگریس کے ذہن میں "ہندوستانی" کا جو تصور ہے اس کی ابھی تک کوئی شکل مرتب نہیں ہوئی ہے اور نہ اس وقت تک مرتب ہوگی جب تک کانگریس کی کاروائی خالص "ہندوستانی" میں نہیں ہونے لگے گی۔ کانگریس کو کانگریسیوں کے استعمال کے لیے ایک لغت مرتب کرنا ہوگا اور ایک شعبہ قائم کرنا پڑے گا جو ایسے لفظ فراہم کرتا رہے جو لغت میں نہ ملے۔ یہ ایک بڑا کام ہے، لیکن اگر ہمیں واقعی ایک کل ہند زندہ اور ترقی کرنے والی زبان حاصل کرنا ہے تو یہ کام اس لائق ہے کہ کیا جائے۔ اس شعبے کو یہ طے کرنا ہوگا کہ موجودہ ادب میں کون کون سی کتابیں، رسالے، ہفتہ وار اخبار اور روزنامے "ہندوستانی" کہلائیں، چاہے وہ اردو لکھاوٹ میں ہوں، چاہے دیوناگری ہیں۔ یہ ایک اہم کام ہے اور اس میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے بہت زیادہ محنت کرنی پڑے گی۔

''ہندوستانی'' زبان بنانے میں ہندی اور اردو کو اس کا معاون سمجھا جا سکتا ہے اس لیے ایک کانگریسی کو دونوں کا بہی خواہ ہونا چاہیے اور جہاں تک ہو سکے دونوں کی جان کاری رکھنا چاہیے۔

اس ہندوستانی زبان میں بہت سے ہم معنی لفظ ہوں گے جو صوبائی زبانوں سے مالا مال اور ترقی کرتی ہوئی قوم کی مختلف ضرورتیں پوری کریں گے جو ہندوستانی زبان بنگالی یا دکھنی بھارت کے سننے والوں کے سامنے بولی جائے گی اس میں قدرتی طور پر سنسکرت سے نکلے ہوئے لفظوں کی تعداد زیادہ ہوگی اور وہی تقریر جب پنجاب میں کی جائے گی تو اس میں عربی اور فارسی سے نکلے ہوئے لفظ ایک بڑی تعداد میں شامل رہیں گے۔ یہی حال ان جلسوں میں بھی ہوگا جن میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہوگی جو سنسکرت سے نکلے ہوئے بہت سے لفظ نہیں سمجھ سکیں گے۔ اس لیے کل ہند مقرروں کے پاس ہندوستانی لفظوں کا ایسا ذخیرہ ہونا چاہیے جس کی مدد سے وہ ہندوستان کے ہر حصے کے لوگوں کے سامنے آسانی سے تقریر کر سکیں۔ اس سلسلے میں پنڈت مالوی کا نام سب سے پہلے آتا ہے۔ میں نے انہیں ہندی بولنے والے اور اردو بولنے والے دونوں طرح کے مجمعوں میں یکساں آسانی کے ساتھ تقریر کرتے سنا ہے۔ میں نے کہیں یہ نہیں دیکھا کہ وہ صحیح لفظ بھول گئے ہوں۔ یہی حال بابو بھگوان داس کا ہے جو ایک ہی تقریر میں ہم معنی لفظ استعمال کرتے رہتے ہیں اور اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ تقریر کی شان نہ بگڑنے پائے۔ مسلمانوں میں اس وقت مجھے صرف مولانا محمد علی کا خیال آتا ہے۔ جن کے لفظوں کا ذخیرہ اتنا بے میل تھا کہ دونوں طرح کے سننے والوں میں کام آسکتا تھا۔ ریاست بڑودہ کی ملازمت کے دوران انہوں نے جو گجراتی سیکھ لی تھی وہ بھی ان کے بڑے کام آئی۔

کانگریس سے کوئی سروکار نہ رکھتے ہوئے بھی ہندی اور اردو دونوں پھولتی پھلتی رہیں گی۔ ہندی زیادہ تر ہندوؤں تک محدود رہے گی اور اردو مسلمانوں تک۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ایسے مسلمان نسبتاً بہت ہی کم ہیں جو ہندی اتنی اچھی جانتے ہوں کہ اس کے عالم کہے جا سکیں۔ اگرچہ میں سمجھتا ہوں کہ جو مسلمان ہندی بول چال والے علاقوں میں پیدا ہوئے ہیں ان کے لیے ہندی مادری زبان کی حیثیت رکھتی ہے اور ہندو ہزاروں ایسے ہیں جن کی مادری زبان اردو ہے اور جو بجا طور پر اردو کے عالم کہے جا سکتے ہیں۔ انہی میں سے ایک پنڈت موتی لال بھی تھے اور دوسری ڈاکٹر تیج بہادر سپرو ہیں۔ اسی طرح اور بھی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ اس لیے دونوں بہنوں کو

آپس میں جھگڑنے یا غیر صحت مند مقابلہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ صحت مند مقابلہ البتہ ہمیشہ جاری رہنا چاہیے۔

مجھے جو خبریں ملی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ مولوی عبدالحق صاحب کی لائق رہنمائی میں عثمانیہ یونیورسٹی اردو کے مفاد کی بڑی خدمت کر رہی ہے۔ اس یونیورسٹی میں اردو کی ایک بڑی فرہنگ موجود ہے۔ سائنس کی کتابیں اردو میں تیار کی گئی ہیں اور تیار کی جا رہی ہیں۔ چونکہ تعلیم دیانت داری کے ساتھ اردو میں ہو رہی ہیں اس لیے اس کی ترقی یقینی ہے۔ آج کل کے بے تکے تعصب کی بناء پر ہندی بولنے والے ہندو اس سے فائدہ اُٹھائیں تو یہ ان کی غلطی ہے، لیکن یہ تعصب بھی ختم ہو کر رہے گا۔ اس لیے کہ فرقوں کی موجودہ پھوٹ تمام دوسری بیماریوں کی طرح صرف عارضی ہے۔ اچھا ہو یا برا، لیکن یہ دونوں اب اَٹوٹ رشتے ہیں۔ ہندوستان سے جکڑے ہوئے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے پڑوسی ہیں اور اسی سرزمین کے سپوت ہیں وہ یہیں پیدا ہوئے ہیں اور یہیں رہیں گے اگر وہ اپنے آپ ایک ساتھ نہ آ گئے تو قدرت انہیں امن کے ساتھ رہنے پر مجبور کر دے گی۔

جو بات ہندوؤں کے لیے ہے وہی مسلمانوں کے لیے بھی ہے۔ ہندی ساہتیہ سمیلن اور ناگری پرچارنی سبھا نے جو تھوڑی بہت محنت کی ہے اس کے نتیجوں سے اگر مسلمان فائدہ نہ اُٹھائیں گے تو ان ہی کا نقصان ہوگا۔ سمیلن نے ہندی کی یہ تشریح کر کے کہ یہ وہ زبان ہے جو اُتر بھارت کے ہندو اور مسلمان بولتے ہیں اور جو اردو اور دیوناگری لکھاوٹ میں لکھی جاتی ہے، جو قدم اُٹھایا ہے (اور سمیلن کے لیے ایک بڑا قدم ہے) اس پر مسلمان کا فخر اور خوشی نہ محسوس کرنا ایک افسوس کی بات ہے۔ جہاں تک تشریح کا تعلق ہے یہ ''ہندوستانی'' کی اس تشریح کے برابر ہے جو کانگریس نے کی ہے۔

میں جانتا ہوں کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو محض اردو یا محض ہندی کے باقی رہنے کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ میرے خیال میں یہ تصور ایک خواب اور ایک ناپاک خواب ہی بنا رہے گا۔ اسلام کا اپنا ایک خاص تمدن ہے۔ اسی طرح ہندومت کا بھی ایک الگ تمدن ہے۔ مستقبل کا ہندوستان ان دونوں کا ایک خوش گوار مجموعہ ہوگا۔ جب وہ مبارک دن آ جائے گا تو ہندوستان دونوں کی مشترکہ زبان ''ہندوستانی'' ہو جائے گی، لیکن اردو پھر بھی عربی فارسی لفظوں کی کثرت کے ساتھ پھولتی پھلتی رہے گی اور ہندی اس وقت بھی سنسکرت لفظوں کی افراط کے ساتھ پروان

چڑھتی رہے گی۔ تلسی داس اور سورداس کی زبان فنا نہیں ہوسکتی اور اسی طرح وہ زبان بھی مٹ نہیں سکتی جس میں شبلی لکھا کرتے تھے، لیکن ان دونوں زبانوں کے بہترین حصے ''ہندوستانی'' بول چال میں پوری طرح گھل مل گئے ہیں۔

(ہریجن۔ ۲۹/اکتوبر ۱۹۳۸ء)

OOO

ہندوستان کی قومی زبان۔ ہندوستانی

موہن داس کرم چند گاندھی

گاندھی جی نے ہندوستان کی قومی زبان کے بارے میں پوری وضاحت کے ساتھ مختلف موقعوں پر اپنے خیالات بیان کیے تھے۔ ان کے خیالات سیکڑوں صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کے کچھ حصے منتخب کر کے تاریخ وار اصل حوالوں کے ساتھ پیش کیے جا رہے ہیں۔

اُردو اور ناگری لکھاوٹ

ہر ایک پڑھے لکھے ہندوستانی کو اپنی بھاشا، ہندو کو سنسکرت، مسلمان کو عربی، پارسی کو فارسی اور سب کو ہندی جاننی چاہیے۔ کچھ ہندوؤں کو عربی اور کچھ مسلمانوں اور پارسیوں کو سنسکرت سیکھنی چاہیے۔ اُتر اور پچھم میں رہنے والے ہندوستانی کو تامل سیکھنی چاہیے، مگر سارے ہندوستان کے لیے تو ہندی ہی ہونی چاہیے۔ اسے اردو میں لکھا جائے یا ناگری میں۔ ہندو اور مسلمانوں کے وچاروں کو ٹھیک رکھنے کے لیے بہت سے ہندوستانیوں کے لیے دونوں لکھاوٹوں کا جاننا ضروری ہے۔ ایسا ہونے پر ہم آپس کے بیوہار میں انگریزی کو نکال باہر کر سکیں گے۔

(ہند سوراج، ۱۹۰۹ء)

سرکاری زبان

ایک خاص معیاد کے اندر ہر صوبے کی عدالتوں اور اسمبلیوں کا کام اس صوبے کی بھاشا میں جاری ہونا چاہیے۔ اپیل کی آخری عدالت کی زبان ہندوستانی قرار دی جائے۔ لکھاوٹ

چاہے دیوناگری ہو یا فارسی، مرکزی سرکاری اور بڑی اسمبلیوں کی بھاشا بھی ہندوستانی ہی ہو۔ انتر راشٹری راج بیوہار کی بھاشا انگریزی رہے۔

(ہندی نوجیون، ۲۶ر دسمبر ۱۹۲۴ء)

ہندو اردو اور مسلمان ہندی سیکھیں

اسے پھر یہاں دُہرائے بنا نہیں رہ سکتا کہ اگر ہندو اپنے بھائیوں کے نزدیک آنا چاہتے ہیں تو اُنہیں اردو پڑھنی ہی چاہیے اور ہندو بھائیوں کے نزدیک آنے کی خواہش رکھنے والے مسلمانوں کو بھی ہندی ضرور سیکھ لینی چاہیے۔ ہندو اور مسلمان کی سچی ایکتا میں جن کا وشواش ہے، باہمی نفرت کے ان خوفناک نظاروں کو دیکھ کر پریشان نہ ہوں، اگر ان کا وشواش سچا ہے تو وہ جہاں جہاں ممکن ہوگا، وہاں وہاں موقع ملنے پر ضرور ان کو رواداری، پریم اور ایک دوسرے کے لیے انسانیت کے کام کرنے پر اُبھارے گا اور دوسرے کی بھاشا سیکھنا تو اس راستے میں سب سے پہلی بات ہے۔ کیا ہندوؤں کے لیے یہ اچھا نہیں کہ وہ بھکتی بھرے دل والے مسلمانوں کی لکھی ہوئی مستند کتابوں کو پڑھیں اور یہ جانیں کہ وہ قرآن اور پیغمبر صاحب کے بارے میں کیا لکھتے ہیں۔ اسی طرح کیا مسلمانوں کے لیے بھی یہ اچھا نہیں کہ بڑے بڑے ہندو بھکتوں کی لکھی دھارمک کتابوں کو پڑھ کر وہ یہ جان لیں کہ گیتا اور شری کرشن کے بارے میں ہندوؤں کا کیا خیال ہے۔ بجائے اس کے کہ دونوں گروہ ان تمام خراب باتوں کو جانیں جو ایک دوسرے کی دھارمک کتابوں اور اُن کے بدلے جانے کے بارے میں جاہلوں اور توڑ مروڑ کر بات کہنے والوں کی زبانی کہی جائیں۔

(نوجیون، ۲۱ جولائی، ۱۹۲۷ء)

ہندی ہندوستانی

میں نے ابھی ''ہندی ہندوستانی'' کا شبد استعمال کیا ہے۔ ۱۹۱۸ء میں جب آپ نے مجھ کو عہدہ دیا تھا تب بھی میں نے یہی کہا تھا کہ ہندی اس بھاشا کا نام ہے، جسے ہندو اور مسلمان قدرتی طور پر بغیر کشش کے بولتے ہیں، ہندوستانی اور اردو میں کوئی فرق نہیں ہے، دیوناگری لکھاوٹ میں لکھی جانے پر وہ ہندی اور عربی لکھاوٹ میں لکھی جانے پر اردو کہی جاتی ہے۔ جو لکھنے

والا یا تقریر کرنے والا چن چن کر سنسکرت یا عربی، فارسی کے شبدوں کا ہی استعمال کرتا ہے وہ دیش کا نقصان کرتا ہے۔ ہماری راشٹر بھاشا میں وہ سب طرح کے شبد آنے چاہئیں جو جنتا میں کام آنے لگے ہیں، پھیلی ہوئی بھاشا میں یہ طاقت رہتی ہی ہے، اسی لیے تو وہ سب جگہ کام میں آتی ہے۔ انگریزی نے کیا نہیں لیا ہے، لاطینی اور یونانی سے کتنے ہی محاورے انگریزی میں لیے گئے ہیں۔ آج کل کی بھاشاؤں کو بھی وہ لوگ نہیں چھوڑتے۔ اس بارے میں ان کی غیر طرفداری تعریف کے لائق ہے۔ ہندوستانی شبد انگریزی میں کافی آگئے ہیں، کچھ افریقہ سے بھی لیے گئے ہیں، اسی میں ان کا فری ٹریڈ قائم ہے۔ پر میرے یہ سب کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بغیر موقع کے ہی ہم دوسری بھاشاؤں کے شبد لیں، جیسا کہ آج کل انگریزی پڑھے لکھے نوجوان کیا کرتے ہیں۔ اس کام میں سوچ وچار کی نظر تو رکھنی ہی چاہیے، ہم کنگال نہیں ہیں پر کنجوس بھی نہیں بنتے۔ کرسی کو خوشی سے کرسی ہی کہیں گے، اس کے لیے ''پرادھیہ پک پد'' شبد کا استعمال نہیں کریں گے۔ اس موقع پر اپنے دُکھ کی بھی کچھ کہانی کہہ دوں۔ ہندی بھاشا راشٹر بھاشا بنے یا نہ بنے، میں اسے چھوڑ نہیں سکتا، تلسی داس کا پجاری ہونے کی وجہ سے ہندی پر میرا موہ رہے گا، لیکن ہندی بولنے والوں میں رویندر ناتھ کہاں ہیں، پرفلا چندر رائے کہاں ہیں، ایسے اور نام بھی میں بتا سکتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ میرے یا میرے جیسے ہزاروں کے چاہنے سے بھی ایسے آدمی تھوڑا ہی پیدا ہونے والے ہیں، لیکن جس بھاشا کو راشٹر بھاشا بننا ہے، اس میں ایسے بڑے بڑے آدمیوں کے ہونے کی اُمید رکھی ہی جائے گی۔

(اندور، ۲/ اپریل ۱۹۳۵ء)

ہندوستانی یا اردو

میں نے اپنے من میں کہا، گجراتی میری مادری زبان ہے، پر وہ راشٹر بھاشا نہیں ہو سکتی، دیش میں تیسویں حصے سے زیادہ آبادی گجراتی بھاشا بولنے والی نہیں۔ اس میں مجھے تلسی داس کی رامائن کہاں ملے گی۔ تو کیا مراٹھی راشٹر بھاشا ہو سکتی ہے؟ مراٹھی بھاشا سے مجھے پریم ہے، مراٹھی بولنے والے لوگوں میں میرے ساتھ کام کرنے والے کچھ بڑے پکے اور سچے ساتھی ہیں۔ مہاراشٹریوں کی قابلیت، آتما بلیدان کی ان کی شکتی اور لیاقت کا میں قائل ہوں۔ تو بھی جس مراٹھی

بھاشا کو لوکمانیہ تلک نے بے مثل طریقے سے استعمال کیا اسے راشٹر بھاشا بنانے کی خواہش میرے دل میں پیدا نہیں ہوئی۔ جس وقت اس سوال پر میں اپنے دل میں دلیلیں کر رہا تھا۔ میں آپ کو بتاؤں کہ اس وقت مجھے ہندی بھاشا بولنے والوں کی ٹھیک ٹھیک گنتی بھی معلوم نہیں تھی، اُس وقت بھی مجھے حود بخود یہ معلوم ہوا تھا کہ راشٹر بھاشا کی جگہ ایک ہندی ہی لے سکتی ہے، دوسری کوئی زبان نہیں۔ کیا میں نے بنگلہ کی تعریف نہیں کی؟ میں نے کی ہے اور رام موہن رائے، رام کرشن، دویکانند اور ودیندر ناتھ ٹھاکر کی ماتری بھاشا ہونے کی وجہ سے میں نے اُسے عزت کی نظر سے دیکھا ہے۔ پھر بھی مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بنگلہ کو انتر صوبائی بیوہار کی بھاشا نہیں بنا سکتے تو کیا دکھن بھارت کی کوئی بھاشا بن سکتی ہے۔ یہ بات نہیں کہ میں ان بھاشاؤں سے بالکل ہی انجان تھا، پر تامل یا دوسری کوئی دکھن بھارتی بھاشا راشٹر بھاشا کیسے ہو سکتی ہے۔ تب ہندی زبان بعد کو جسے ہم ہندوستانی یا اردو بھی کہنے لگے ہیں اور جو ناگری اور اردو لکھاوٹ میں لکھی جاتی ہے وہی ہماری زبان ہو سکتی ہے اور ہے۔

(ہریجن سیوک، ۳ر اپریل ۱۹۳۷ء)

مولوی عبدالحق اور راجندر بابو کا اکٹھا بیان

مولوی عبدالحق صاحب اور شری راجندر بابو نے ہندی اردو بحث کے بارے میں جو اکٹھا بیان نکالا ہے، اس سے یہ اُمید کی جاسکتی ہے کہ یہ بحث اب ختم ہو جائے گی اور جو لوگ انتر صوبائی بھاشا میں دلچسپی رکھتے ہیں، وہ اس سوال پر اس کی اچھائی برائی کی ہی نظر سے وچار کر سکیں کے اور سب مل کر کسی اچھی عملی بات پر بھی پہنچ سکیں گے۔ بیان یہ ہے:

پٹنہ میں تاریخ ۲۸ر اگست کو بہار اردو کمیٹی کی جو بیٹھک ہوئی تھی، اس موقع پر ہمیں ہندوستانی بھاشا کے سوال کے بارے میں ایک دوسرے کے ساتھ اور دوسرے بھی کچھ دوستوں کے ساتھ بحث کرنے کا موقع ملا۔ اردو، ہندی، ہندوستانی کی بحث کے بارے میں جو غلط فہمیاں بدقسمتی سے پیدا ہو گئی ہیں، اُن کو دُور کرنے کی فکر ہمیں تھی۔ ہمیں یہ کہتے ہوئے خوشی ہوتی ہے کہ اس سوال کے بہت سے حصوں پر ہم نے بحث کی اور ہم نے دیکھا کہ اس بات چیت میں آئے

ہوئے بہت سے سوالوں میں ہم لوگوں کی ایک رائے ہے۔ ہم اس بات پر اتفاق کرتے ہیں کہ ہندوستانی کو ہندوستان کی راشٹر بھاشا ہونا چاہیے اور وہ اردو اور دیوناگری دونوں لکھاوٹوں میں لکھی جانی چاہیے اور سرکاری دفتروں اور شکشا میں دونوں لکھاوٹوں کو قبول کر لینا چاہیے۔

ہندوستانی ہم اُس زبان کو کہتے ہیں جسے اُتر ہندوستان میں آدمیوں کا بہت بڑا طبقہ بولتا ہے اور ہم مانتے ہیں کہ جو شبد، عام کاروبار میں استعمال ہوتے ہیں، انہیں چن کر ہندوستان کے ذخیرے میں داخل کر لینا چاہیے اور ہم یہ بھی مانتے ہیں کہ اردو ہندی دونوں کو اور ادب میں استعمال ہونے والی بھاشاؤں کو اُن کی ترقی کے لیے پورا موقع ملنا چاہیے، ہماری تجویز یہ ہے کہ اردو اور ہندی کے عالموں کی مدد سے ہندوستانی لفظوں کی ایک ڈکشنری تیار کرنے کی کوشش ہونی چاہیے۔ ایسی لغت بنانے کے لیے اور لفظوں کے چناؤ اور ایسے دوسرے کاموں کے لیے ہندی اردو کے ماہرین کی ایک چھوٹی سی کمیٹی مقرر کرنی چاہیے۔ اردو ہندی کے لیے ایسے وزن دار حامیوں کی یہ کمیٹی بنی چاہیے جو یہ مانتے ہوں کہ ان دونوں زبانوں کو ایک دوسرے کے زیادہ نزدیک لایا جائے اور ہندوستانی بھاشا کی ترقی کو اُکسایا جائے اور اس طرح ان دونوں زبانوں کے بولنے والوں کے بیچ رواداری پیدا کی جائے۔ جتنی جلدی ہو سکے اتنی جلدی یہ کمیٹی بلائی جائے۔ ہمیں اُمید ہے کہ اس بیان کے نکالنے والے ایسے ہندوستانی لفظوں کو تیار کرنے کا، جنہیں سب پارٹیوں کے لوگ منظور کر سکیں، جلدی ہی کام شروع کریں گے اور اس کام کے لیے اور بہت سے بڑے بڑے سوالوں کو حل کرنے کے لیے جس کمیٹی کا بنانا انہوں نے طے کیا ہے اُسے فوراً ہی مقرر کریں گے۔ اگر کام کو جلدی سے سلجھانا ہے تو میں اس بات پر زور دوں گا کہ کمیٹی جہاں تک ہو، چھوٹی ہونی چاہیے۔

(ہریجن سیوک، ستمبر ۱۹۴۷ء)

ہندوستانی کیوں؟

مجھے آج دو گرنتھ دیے گئے ہیں، وہ دونوں اونچی زبان میں لکھے گئے ہیں، لیکن ایک ہی لپی میں۔ ہمارا کاروبار دونوں لپیوں میں ہونا چاہیے، کیونکہ ہندوستانی کی دو لپیاں ہیں، اتنا تو ہمیں کرنا ہی چاہیے۔ اب سب لوگ ہندوستانی سیکھ لیں، کوئی آدمی یہاں اُتر سے اور اُتر سے ہی کیوں، آندھرا دیش سے، تامل دیش سے چلا آئے تو اس سے یوں کہنا کہ یہاں کی چاروں

زبانیں سیکھو، چار ہی کیوں، دس بارہ زبان سیکھ لو، یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، لیکن جتنی طاقت آپ کو اس میں خرچ کرنی پڑتی ہے اس میں سے اگر کچھ بھی آپ ہندوستانی کے لیے خرچ کریں تو آسانی سے آپ ہندوستانی سیکھ سکتے ہیں۔ ہندوستانی ہندوستان کی بھاشا ہے، وہ سب صوبوں کی بھاشا ہونی چاہیے، اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ تامل ناڈ میں تامل کا، آندھرا پردیش میں تیلگو کا، ملابار میں ملیالم کا، اور کرناٹک میں کنٹری کا، کوئی استھان نہیں ہے۔ صوبوں کی اپنی اپنی بھاشائیں ہیں اور ہونی چاہئیں، لیکن جب ہم ایک دوسرے صوبے میں چلے جاتے ہیں تو ہماری ایک ایسی عام بھاشا ہونی چاہیے جو سب لوگ سمجھ سکیں۔ ہوسکتا ہے کہ سب کے سب نہ سمجھیں، لیکن اتنا تو ہوسکتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ سمجھیں۔ یہ تب ہی ہوسکتا ہے جب لوگ جان بوجھ کر اور دھیان سے ہندوستانی سمجھ لیں اور سیکھ لیں۔ تب لوگوں میں ایک طرح کی ہندوستانی فضا بن جاتی ہے۔ اس میں ضرور تھوڑی سی محنت ہوگی، لیکن جب ایک بار ماحول بن جائے گا تو اسے سکھانے کے لیے کسی کو زیادہ محنت نہ کرنی پڑے گی۔ اس فضا میں سے وہ اپنی ضرورت کی چیز کھینچ لے گا۔ ہندوستانی کا جب ماحول پھیل جاتا ہے۔ تب ہم اس میں سے اپنی ضرورت کی چیز کو لے لیں گے، جیسے کہیں سنگیت چلتا ہے، وہ بھی مدھر سنگیت، تو آپ اس کو بہتر سمجھ لیتے ہیں، محسوس کر لیتے ہیں، وہ مجھ کو سکھانے کی ضرورت ہی کیا۔ ایسے ہی اگر ہندوستانی کو کروڑوں آدمی سمجھنے لگ جائیں تو دیش میں ایک ہندوستانی فضا بن جائے گی اور اس سے ہندوستانی عام ہوگی اور آسان ہوگی۔ مجھ کو دُکھ ہے کہ آپ لوگ وہ سب جو میں کہہ رہا ہوں پوری طرح سمجھنے لگ جائیں تو دیش میں ایک ہندوستانی فضا بن جائے گی اور اس سے ہندوستانی عام ہوگی اور آسان ہوگی۔ مجھ کو دُکھ ہے کہ آپ لوگ وہ سب جو میں کہہ رہا ہوں پوری طرح سمجھتے نہیں۔ آپ مجھ سے بڑی محبت کرتے ہیں، کیونکہ آپ جانتے ہیں کہ میں کنگالوں کی اور غریب لوگوں کی سیوا کرتا ہوں۔ اگر میں ہندوستانی میں بولوں تو آپ اسے شانتی سے سُن لیتے ہیں، وجہ یہ ہے کہ میری آواز آپ لوگوں کو مدھر لگتی ہے۔ میں آج تو یہاں سیدھی کام کی بات کہہ رہا ہوں، کام کی بات کہوں تو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ سمجھ سکتے ہیں۔ میں آپ کو ایک اور گر، بھید اور رہس بتاتا ہوں۔ ہندوستانی میں پریم بھی ہے، وہ یہ ہے کہ جب ایک آدمی کے دل میں ہندوستانی کا پریم جاگ جائے گا تب وہ اپنی لڑکی سے، پتنی سے اسی زبان میں بولنے لگے گا۔ اگر وہ نوکر رکھتا ہے تو اس سے اور اپنے دوستوں سے بھی اسی میں بولے گا، لیکن آج تو گھر گھر میں انگر ۔ ی زبان کا پرچار ہے۔ انگریزی زبان کی شراب لوگوں نے پی لی اور آج

کلبوں میں، گھروں میں سب جگہ وہ انگریزی زبان ہی بولتے ہیں، ہندوستانی تہذیب اس میں نہیں رہتی۔ ایسی حالت اور کہیں نہیں ہے، صرف ہمارے غلام ملک ہندوستان میں یہ حالت ہے۔ ہم نے اپنے کو غلامی کی زنجیر میں باندھ لیا ہے۔ آپ کو محنت کر کے، ہمت کر کے اپنے گھروں میں بھی یہی بھاشا بولنی چاہیے، باہر تو آپ بولیں گے ہی۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ سب کے سب ہندوستانی سیکھ لیں۔۔۔۔

ہندوستان کی چار کروڑ کی آبادی ہے۔ جب میں اردو کی بات کرتا ہوں تو ایسا سمجھا جاتا ہے کہ یہ مسلمانوں کی بھاشا ہے، ویسے ہی ہندی کی بات کرتا ہوں، تو وہ ہندوؤں کی بھاشا ہے، اب یہاں تو آپ کو ایک قوم کی بھاشا سیکھانے کی بات نہیں ہے، ایک دھرم کی بھاشا سیکھانے کی بات نہیں ہے۔ آپ میں سے کچھ جانتے ہوں گے کہ پنجاب میں سب پڑھے لکھے ہندو اور مسلم اردو جانتے ہیں، وہ ہندی بول نہیں سکتے، کشمیر میں بھی اسی طرح اچھی اردو لکھنے والے ہندو ہیں۔ سنسکرت بھری ہندی وہ نہیں سمجھتے، اردو سمجھتے ہیں، اس لیے میں آپ سے کہوں گا کہ آپ کا دھرم یہ ہے کہ آپ اردو لپی بھی سیکھیں۔۔۔۔

(ہندی پرچار سبھا کے جلسے کی ایک تقریر کا خلاصہ، ۲۵ر جنوری ۱۹۴۶ء)

قومی زبان

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قومی زبان کے متعلق یہ جھگڑا کھڑا ہو گیا ہے کہ قومی زبان کیا ہو۔ مجھ سے کہا گیا ہے کہ وہ ہندی ہو گی جو دیوناگری حروف میں لکھی جائے گی، میں تو کبھی اس پر رضا مند نہیں ہو سکتا۔ میں دو دفعہ ہندی ساہتیہ سمیلن کا صدر رہ چکا ہوں۔ میں اردو یا ہندی کا دشمن نہیں ہو سکتا، لیکن میں یہ سمجھ چکا ہوں کہ عوام کی زبان اور ہندوستان کی قومی زبان صرف وہی ہو سکتی ہے جو اردو ہندی کا مرکب ہو اور دیوناگری اور اردو دونوں رسم خط میں لکھی جائے، یعنی ہندوستان میں بہت سے ہندوؤں کو جانتا ہوں، قطع نظر مسلمانوں کے، جو سنسکرت ملی ہوئی ہندی کو نہیں سمجھ سکتے اور نہ دیوناگری رسم خط میں لکھ سکتے ہیں، لہٰذا میں تو ہندوستانی ہی زبان پر زور دیتا رہوں گا، چاہے میں اس کی تائید میں بالکل تنہا رہوں۔ آج مسلمان اپنے کو ہندوؤں کا دشمن سمجھیں، مگر ہندوستان کو انہیں اپنے ساتھ متفق کرنا ہے، نہ تو چاپلوسی سے، نہ خوشامد سے اور نہ دشمنی کے ذریعے سے۔ یہ تو صرف دوستی ہی کے ذریعے سے ہو سکتا ہے جو بہادروں کا عدم تشدد ہے، میں تو کبھی بزدلی کا

سبق نہیں دے سکتا، میں ایک راسخ العقیدہ ہندو ہوں، لیکن میرا مذہب مجھے تمام مذاہب کے ساتھ یکساں رواداری سکھاتا ہے۔

(ہریجن، ۲؍اگست ۱۹۴۷ء)

مشترک زبان

اگر ہندوستان کے مسلمان ہندوستان کے وفادار ہیں اور انہوں نے اپنی آزاد مرضی سے اس ملک کو اپنا ملک بنایا ہے تو اُن کا فرض ہے کہ وہ دونوں رسم خط سیکھیں۔۔۔ یونین کے لیے ضروری ہے کہ اس کے پاس ایک ایسی مشترک زبان ہو جو تمام صوبوں میں پڑھی اور لکھی جاسکے۔ میں تو ایک قدم اور آگے جاؤں گا اور کہوں گا کہ اگر دونوں ملک (پاکستان اور ہندوستان) ایک دوسرے کے دوست رہیں تو ہندوستانی زبان کو اُن دونوں کے درمیان ''مشترک زبان'' ہونا چاہیے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ اردو اور ہندی ایک جداگانہ بولی کی حیثیت سے باقی نہ رہیں۔ ان دونوں کو باقی رہنا چاہیے اور ترقی کرنی چاہیے، لیکن اگر ہندوستان میں ہندو اور مسلمان بلکہ تمام مذاہب کے لوگ آپس میں دوست ہوں تو انہیں ایک ایسی مشترکہ زبان کو قبول کرنا چاہیے جو ہندی اور اردو کے اشتراک سے پیدا ہوئی ہے۔ انہیں دونوں رسم خط سیکھنے چاہئیں اور یہی اِنڈین یونین کے ہندو اور مسلمانوں کا امتحان ہوگا۔ یہ کہنا غلط ہوگا کہ اگر یونین کے مسلمان ناگری سیکھنے سے اِنکار کریں تو ہندوستانی زبان نہیں بن سکتی۔ خواہ مسلمان ناگری سیکھیں یا نہ سیکھیں مگر ہندوؤں اور تمام دوسرے مذہب کے لوگوں کو دونوں رسم خط سیکھنے چاہئیں۔ یہ ممکن ہے کہ موجودہ زہر آلود فضا میں سادہ بات سمجھ میں نہ آئے۔ اگر ہندو چاہتے ہیں کہ وہ اردو زبان اور اردو الفاظ اور اردو رسم خط کا بائیکاٹ کریں، لیکن ایسا کرنے سے نقصان سب ہی کا ہوگا، لہٰذا جو لوگ ہندوستانی پرچار کے کام میں مصروف ہیں، وہ اپنے اعتقاد اور کوشش کو کمزور نہ کریں۔

(ہریجن، ۵؍اکتوبر ۱۹۴۷ء)

اردو ہندوستان میں پیدا ہوئی

ایک نامہ نگار نے لکھا ہے کہ انہیں میری زبان سے یہ سُن کر تعجب اور رنج ہوا کہ مجھے انگریزی زبان میں خطوط ملتے ہیں تو دُکھ ہوتا ہے۔ میں نے تو کہا تھا کہ ہندوستان سب کا دوست

ہے، لہٰذا اگر مسلمانوں اور انگریزوں کے متعلق مساوی طور پر میں دوستانہ احساسات رکھتا ہوں تو پھر کیا بات ہے کہ میں اردو کو محفوظ رکھنے اور انگریزی کو جگہ سے ہٹا کر اس کی جگہ دوسری زبان رکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ مجھے اس سوال پر سخت حیرت ہوئی۔ اس سے حقائق سے انتہائی بے خبری ظاہر ہوتی ہے۔ انگریزی تو ایک غیر ملکی زبان ہے، اردو تو ایسی نہیں ہے۔ مجھے تو اس بات پر فخر ہے کہ اردو ایک ایسی زبان ہے جو ہندوستان میں پیدا ہوئی اور ہندوستانی زبان ہے، شروع میں تو زبان وہ تھی جو مسلمانوں کی حکومت کے زمانے میں فوجی کیمپوں میں بولی جاتی تھی اور فوج میں زیادہ تر ہندوستانی لوگ تھے ___ ہندو بھی اور مسلمان بھی ___ مسلمان حکمرانوں نے ہندوستان کو اپنا وطن بنا لیا تھا۔۔۔ جب سے کہ جنوبی افریقہ سے میں ہندوستان واپس آیا ہوں، میں تو بہ آواز دہل کہتا رہا ہوں کہ ہندوستان کی قومی زبان سوائے اُس زبان کے اور کوئی زبان نہیں ہو سکتی جسے شمالی ہندوستان میں ہندو اور مسلمان بولتے ہیں اور جو ناگری اور اردو رسم خط میں لکھی جاتی ہے، وہی شاعر تلسی داس کی زبان تھی، اس شاعر اور مردِ خدا نے اپنے زمانے میں بھی فارسی اور عربی کے الفاظ کے استعمال کرنے میں تکلف نہیں کیا تھا۔۔۔ یہی زبان جس نے اب ترقی کر لی ہے، انتر صوبائی زبان ہے، جو دونوں رسم خط میں لکھی جاتی ہے۔ اردو ایک ایسی زبان ہے، جس میں عربی اور فارسی کے الفاظ زیادہ ہیں۔ ہندی میں ان کو خارج کرنے کا رجحان ہے۔ ہندوستانی ان دونوں کا ایک خوش گوار مرکب ہے، جس کی گریمر پر فارسی یا عربی کا اثر نہیں پڑا ہے۔

(۱۸ر دسمبر ۱۹۴۷ء)

میرے بعد میرے الفاظ یاد کرو گے!

لالہ لاجپت رائے میرے دوست تھے اور میں انہیں یہ کہہ کر چھیڑا کرتا تھا کہ آخر وہ کب خالص ہندی زبان میں لکھنا پڑھنا سیکھیں گے۔ لالہ جی کہا کرتے تھے کہ وہ ایسا نہیں کر سکتے (حالانکہ وہ بہت پُر جوش آریہ سماجی تھے) اس لیے کہ اُن کی مادری زبان اردو ہے۔ اسی زبان میں وہ جلسوں کے حاضرین کو مسحور کر دیا کرتے تھے۔ میں دو دفعہ ہندی ساہتیہ سمیلن کا صدر رہ چکا ہوں اس وقت تو سمیلن قومی زبان کے متعلق میری کوششوں کا سواگت کرتی تھی مگر اب کیوں وہ اس بات کو ناپسند کرتی ہے۔ کیا اردو اور ہندی کو ملا کر ایک زبان بنانے کی کوشش کر کے میں کمتر درجے کا ہندو یا ہندوستانی ہو گیا؟۔۔۔ کیا وہ ایک کل ہندوستان کی زبان کی خدمت کر سکتے ہیں اگر اردو رسم

خط اور اردو زبان کو اس سے خارج کر دیا جائے؟ میں ہمیشہ تو تمہارے پاس رہوں گا نہیں، مگر تم میرے رخصت ہو جانے کے بعد میرے الفاظ کو یاد کرو گے؟۔۔۔۔ عدم رواداری مذہب کی نفی ہے۔

(۱۸/دسمبر ۱۹۴۷ء)

ooo

اردو، ہندی ایک تاریخی جائزہ

جاوید اختر بھٹی

یہ گاندھی جی کے تعصب ہی کا نتیجہ تھا کہ اردو کو صرف مسلمانوں کی زبان قرار دے دیا گیا اگر وہ اردو زبان کے پسِ منظر سے واقف ہوتے تو اُسے مسلمانوں کی زبان قرار نہ دیتے۔ میں اُن ہندو ادیبوں اور شاعروں کی عظمت کو سلام کرتا ہوں جن کے خلوص نے سیاست کو شکست دی اور اردو کو زندہ رکھا۔ اس سے یہ بات بھی ثابت ہو جاتی ہے کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان نہیں۔

گاندھی جی نے سرتیج بہادر سپروؔ کے یہ الفاظ نظر انداز کر دیئے۔ جو ''ہماری زبان'' کے ہر شمارے کی پیشانی پہ روشن ہیں۔

> ''اردو زبان ہندو مسلمان دونوں کو اپنے آباؤ اجداد سے ایک مشترکہ و مقدس ترکہ کی حیثیت سے ملی ہے جو قطعاً نا قابلِ تقسیم ہے۔''

آج بھارت میں اردو کے مستقبل کے بارے میں ہندو مسلمان دونوں تشویش کا اظہار کر رہے ہیں کہا جاتا ہے کہ ''بھارت میں اردو کا کوئی مستقبل نہیں ہے۔'' یہ کوئی نئی بات نہیں۔ میں نے اس بات کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ اردو کو کچلنے کا یہ سلسلہ اُس وقت سے شروع ہے جب نہ ہندوستان آزاد ہوا تھا اور نہ ہی تقسیم ہوا تھا۔

گاندھی جی بہت بڑے سیاستدان تھے اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں، لیکن یہ بھی ایک کھلی حقیقت ہے کہ گاندھی جی اردو کے دوست ہرگز نہیں تھے اگر میں یہ کہوں کہ انہیں اردو سے خواہ مخواہ کا بیر تھا تو شاید زیادہ مناسب ہوگا۔ انہوں نے اردو پر مسلسل ''قاتلانہ'' حملے کیے، لیکن یہ اردو

کی ہی ''قوتِ برداشت'' ہے کہ یہ آج بھی زندہ ہے ورنہ گاندھی جی نے تو شاید اس ''بیچاری'' کو مار ہی ڈالا تھا۔

کل اگر گاندھی جی نے سر تیج بہادر سپرو کے الفاظ نظر انداز کئے تھے تو تقسیم ہند کے بعد بھارت کی ہر قیادت نے کرشن چندر کے ان لفظوں سے آنکھیں پھیر لیں۔

''اگر امریکہ اور انگلینڈ دو مختلف قومیں ہوتے ہوئے ایک
دوسرے سے ہزاروں میل دُور ہوتے ہوئے بھی ایک زبان
کو رکھ سکتے ہیں اور اسے اپنی تہذیبی روح کا مرکز بنا سکتے ہیں
تو ہندوستان اور پاکستان ساتھ ساتھ رہتے ہوئے بھی کیوں
اس زبان کو اپنا نہیں سکتے۔''

جس موضوع پر میں نے قلم اُٹھایا ہے یہ موضوع اور یہ مسئلہ نیا نہیں اس پر اس سے پہلے بھی بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ میرا مقصد یہ ہے کہ پڑھنے والوں کو یہ احساس ہو کہ اردو پر ایسا مشکل دَور بھی گذرا ہے۔

ہندوستان کے سیاست دان، حقیقت کو نظر انداز کرتے رہے، وہ نفرت کے بیج بوتے رہے وہ ذہنوں کو تعصب زدہ کرتے رہے۔ جب میں گاندھی جی کا خط پڑھتا ہوں تو مجھ پر یہ بات کھلتی ہے کہ بیسوی صدی میں ہندوستان میں لسانی تعصب کو ہوا دینے والا ہندوستانیوں کا باپو مہاتما گاندھی تھا۔

گاندھی جی، جنہوں نے ہندی کو ہندوؤں کی زبان قرار دیا اور اردو کو مسلمانوں کی ____ اور پھر اُن کے سر پہ ''ہندی ہندوستانی'' کا بھوت سوار ہو گیا۔ جسے وہ ہندوستانیوں کی مشترکہ زبان قرار دیتے تھے۔

یہ خط گاندھی جی نے ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کے نام اردو میں لکھا تھا دراصل مولوی موصوف نے گاندھی جی کو آل انڈیا اردو کانفرنس میں شرکت کی دعوت بذریعہ تار دی تھی یہ کانفرنس ۲۹، ۳۰ دسمبر ۱۹۳۹ء کو دہلی منعقد ہوئی۔

اس خط کا عکس یکم جنوری ۱۹۴۰ء کو پندرہ روزہ ''ہماری زبان'' میں نمایاں طور پر شائع کیا گیا

بھائی صاحب

آپکا تار ملا تھا۔ مجھے دکھ ہے
کی آپکے جلسے میں میں حاضر نہیں
ہو سکتا ہوں۔ میری امید ہے کہ
جلسہ ہر طرح کامیاب ہوگا
آپ جانتے ہیں کی میں اردو
زبان کی ترقی چاہتا ہوں۔ میرا
خیال ہے کی سب ہندو جو ملک کی
خدمت کرنا چاہتے ہیں اردو سیکھیں
اور مسلم ہندی سیکھیں،
سیگاوں
وردھا ۱۲-۱۰-۳۹ کو
آپکا
مو ک گاندھی

گاندھی جی نے اپنے خط میں کانفرنس سے شرکت سے معذوری کا اظہار کیا، ہندی اور اردو کی قسمت کا فیصلہ بول دیا۔

''ہندو جو ملک کی خدمت کرنا چاہتے ہیں اردو لکھیں اور مسلم ہندی سیکھیں۔''

گاندھی جی نے اس نظریئے کو نظرانداز کر دیا۔ ہندی کے بعد وہ مسلسل ''ہندی ہندوستانی'' کا نعرہ لگاتے رہے۔ اس ''ہندی ہندوستانی'' پر ہندو مسلم دونوں نے بڑے دُکھ کا اظہار کیا مگر قوم اپنے باپو کو اپنی محبوب زبان کے قتل سے باز نہ رکھ سکی (ہرچند کہ زبان اردو باپو سے قتل نہ ہوئی لیکن باپو کے لگائے ہوئے زخم آج بھی تازہ ہیں)۔

''اب جہاں تک اردو کو مسلمانوں کی زبان اور ہندی کو ہندوؤں کی زبان سمجھنے کا تعلق ہے تو یہ غلطی سب سے زیادہ بُری طرح گاندھی جی سے سرزد ہوئی اور گاندھی جی ہندوؤں کے مسلم الثبوت رہنما بھی ہیں اور کانگریس کے سب سے بڑے پیشوا۔ ان کی اس غلطی کا اثر سارے ملک پر بہت برا پڑ۔ انصاف پسند ہندو مسلمان دونوں نے ان کو اس غلطی سے آگاہ کیا لیکن ۔۔۔۔ کل ہند اردو کانفرنس کے نام جو پیام گاندھی جی نے بھیجا اس میں بھی انہوں نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔۔۔۔ کانگریس تو اس کا بہت کچھ طرزِ عمل گاندھی جی کے اشاروں ہی پر منحصر ہے، لیکن پنڈت جواہر لال نے گاندھی جی کی اس رائے کو غلط ٹھہرایا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کانگریس میں بھی صرف ایک طبقہ گاندھی جی کی اس رائے سے متفق ہے ایسی صورت میں یہ اور بھی زیادہ تعجب انگیز بات ہے کہ کانگرسی وزارت کے زمانے میں اس غلطی کا اَزالہ نہ کیا گیا بلکہ اس غلط نظریے کو اپنا مسلک بنالیا گیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کانگرسی وزارت کے زمانے میں ایسے ہی لوگوں کا غلبہ رہا تھا۔ گاندھی جی کی رائے سے متفق تھے۔'' (۱)

میاں بشیر احمد لکھتے ہیں:

''۱۹۳۶ء میں گاندھی جی نے اردو پر کھلم کھلا حملہ کیا اور اسے مسلمانوں کی زبان پکارا ۳۷ء میں کانگریس نے سات صوبوں کی حکومت سنبھالی اور کبھی ہندوستانی کے بھیس میں اور کبھی علانیہ ایک بڑے پیمانے پر ہندی کی حمایت شروع کر دی۔ اس وقت سے ہندی کی ترقی اور اردو کی مخالفت کا یہ کام برابر جاری ہے۔ اکثر کانگرسی مسلمانوں اور بعض غیر کانگرسی ہندوؤں نے اس مہا سبھائی ذہنیت پر ناراضگی کا اظہار کیا ہے، لیکن اردو ہندی کی یہ خلیج روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ ۱۸ر دسمبر ۱۹۳۸ء کو ہندوستان کے طول و عرض میں یومِ اردو منایا گیا۔ جس میں بہت سے ہندوؤں نے بھی حصہ لیا۔'' (۲)

میاں بشیر احمد اپنے اسی مضمون کی دوسری قسط میں لکھتے ہیں:

''چند نمونے ریڈیو کی زبان آفرینی کے یعنی دہلی ریڈیو خبروں کے ''نشتر'' کے ساتھ زبان کے لیے ایک حشر بھی برپا کر رہا ہے۔'' (۳)

اس ''زبانی تجربے'' سے جو شورش پیدا ہوئی ہے اس سے گھبرا کر دہلی ریڈیو نے اردو ہندی کے بعض لیڈروں کو دعوت دی کہ وہ ہندوستان والوں کو بتائیں کہ ''ہندوستانی کیا ہے؟'' چنانچہ اس موضوع پر چھے تقریریں ڈاکٹر تارا چند، مولوی عبدالحق، بابو راجندر پرشاد، ڈاکٹر ذاکر حسین، پنڈت وتاتریہ کیفی اور آصف علی صاحب نے ۲۰ سے ۲۶ فروری تک نشر کیں۔ یہ تقریریں بہت سبق آموز ہیں اور ان سے اس نفسیاتی طوفان کی کچھ حقیقت معلوم ہوتی ہے جو اس وقت ہندوستان کے دل پر ٹوٹ رہا ہے اس ضمن میں دو باتیں بہت دلچسپ ہیں ایک یہ کہ سوائے عبدالحق کے کسی مقرر نے وہ زبان استعمال نہیں کی جو روزمرہ بولتا ہے اور دوسرے یہ کہ ہندی کے حامی مقرر باوجود انتہائی کوشش کے گاندھی جی اور سمپورن نند کے ''دیا کھیانوں'' والی ''راشٹر بھاشا'' پر پورے اتر نہ سکے اس ریڈیوی تجربے نے ناکام رہ کر دراصل ہندوستانی کا سہرا روزمرہ کی اردو کے سر پہنا دیا۔

یہ سب کچھ ہو رہا ہے اور باقاعدہ اور منظم اور مسلسل طور پر ہو رہا ہے۔ ہندی، اردو کی یہ جنگ جو غدر کے دس سال بعد ۱۸۶۷ء میں شروع ہوئی اور جو بیسویں صدی کے آغاز سے زیادہ تیز ہو گئی اور پچھلے تین سال سے گاندھی جی کی سیاسی سرپرستی ہیں۔ علانیہ طور پر ہر قومی محاذ سے چھیڑ دی گئی۔ ہندو مسلمانوں کو ایک دوسرے سے الگ الگ کرنے میں کامیاب ہو رہی ہے۔ (۳)

مولوی عبدالحق صاحب نے اپنی ایک تقریر میں کہا:

> ''اپریل ۱۹۳۶ء میں آکھل بھارتیہ ساہتیہ پریشد (سبحان اللہ کیا پیارا نام ہے) کے بھرے اجلاس میں جو ناگ پور یونی ورسٹی کے ہال میں منعقد ہوا۔ گاندھی جی سے اردو، ہندی کے متعلق گفتگو اور بحث ہوئی اور اس کا جو انجام ہوا وہ آپ سب کو معلوم ہے۔ پریشد کے فیصلے اور گاندھی جی اور ان کے رفقاء کے اس اعلان نے کہ وہ ہندی کو ہندوستان کی عام زبان بنا کر رہیں گے ہمیں خواب خرگوش سے بیدار کیا اس وقت ہماری آنکھیں کھلیں اور ہم سمجھے کہ کمروں میں بیٹھ کر کاغذ سیاہ کرنے اور قلم گھسنے سے کیا حاصل اور یہ سب کچھ کس دن کے لیے آخر میں انجمن کے اغراض و مقاصد میں ایک مقصد اور بڑھانا پڑا اور وہ تھا ''اردو زبان کی اشاعت وحفاظت'' انجمن اب میدان میں آئی۔ پہلی مہم کا آغاز اسی شہر سے ہوا جسے میں نے اس کے بعد سے جاگ پور کا نام دیا کیوں کہ اسی نے ہمیں اور آپ کو جگایا تھا۔ یہاں انجمن کی شاخ قائم کی کانگریس گورنمنٹ کے وزیروں سے خط و کتابت کی، ملاقات کی، وفد لے کر گئے اپنے مطالبے پیش کیے، اردو کی حمایت میں جلسے کیے، دیا مندرا اسکیم سے سب سے پہلے انجمن نے اختلاف کیا اس بارے میں وزیر تعلیم سے ملاقات کی اور مراسلت بھی کی۔ گاندھی جی کو کھلی چٹھی لکھی اور اس کے بعد یہ بحث کل ہند مسئلہ بن گئی۔'' (۴)

سروجنی نائڈو نے کہا ''اردو ہندی کی بیٹی ہے''۔ علامہ کیفی دہلوی صاحب نے اس کا

جواب دیا۔

''کچھ عجیب بات ہے کہ ایک چیز سیاست دان (جسے ہم سیاس کہتے ہیں) کے ہاتھ میں پڑ کر کچھ سے کچھ ہو جاتی ہے اس کا حلیہ ہی بدل جاتا ہے کل کی بات ہے گاندھی جی نے ایک صاحب سے گفتگو کے دوران میں یہ فرمایا کہ اردو اور ہندی تو گنگا اور جمنا ہیں مگر ہندوستانی سرتی ہے جو ابھی ظاہر نہیں ہوئی۔ ابھی سنگم نامکمل ہے۔'' معلوم نہیں ان کی اس سے کیا مراد ہے۔۔۔۔ جب مہاتما جی کو ہندوستانی کا وجود نہیں نظر آیا تو کیا تعجب ہے کہ سروجنی دیوی جی کو اردو ہندی کی گود میں لیٹی، اس کا دودھ پیتی دکھائی دی۔ اس کو vios کہیے دنیا آج کل عجائب خانہ بنی ہوئی ہے۔'' (۵)

اور سنیے، مہاتما گاندھی چاہے چونی کے ممبر کانگریس کے ہوں یا نہ ہوں، کانگریس کے ساتھ جو تعلق اُن کا ہے وہ معاصر تیج سے چھپا ہوا نہیں۔ موصوف کانگرس کے روح رواں ہیں اس کو نہ ماننا محض ہٹ دھرمی ہے اب سنیے وردھا کا ہندی ماہ نامہ راشٹر بھاشا جنوری ۴۵ء کی اشاعت لکھتا ہے۔

''بائیس کروڑ ہندوستانی آدمی اسے (ہندی کو) بولتے ہیں۔۔۔ اسی لیے پوجیہ باپو جی (مہاتما گاندھی) نے دکھن کے دراوڑ دیسوں میں اور مہاراشٹر، گجرات، سندھ، آسام، اُتکل اور بنگال وغیرہ صوبوں میں جہاں ہندی رائج نہ تھی تنظم کی شکل میں راشٹر بھاشا کا پرچار کرایا۔'' (ہم نے صرف زبان کو سہل کر دیا) اسکے بعد کیا کچھ اور کہنے کی ضرورت باقی رہی ہے۔'' (۶)

۲۶ اور ۲۷ر فروری ۱۹۴۵ء کو وردھا میں کانفرنس ہوئی ۱۶ر مارچ ۴۵ء کے ''ہماری زبان'' میں اس کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا گیا ہے اس سلسلے میں تین مضمون شامل کیے گئے ہیں۔ پہلے مضمون کا عنوان ہے ''وردھا میں کیا ہوا؟''

دوسرا ''ہندوستانی پرچار سبھا'' اور تیسرا کیفی دہلوی صاحب کا مضمون ''تین دن وردھا میں''۔ ''ہندوستانی پرچار سبھا'' یہ مضمون دراصل ''ہماری زبان'' کے نامہ نگار کی رپورٹ ہے۔ یہ

تینوں اجلاسوں کی رپورٹ ہے جو کہ وردھا میں ہوئے۔ اس کے مطابق ۲۶ رفروری کی سہ پہر کو پہلا اجلاس کامرس کالج وردھا کے ہال میں شروع ہوا۔ گاندھی جو ٹھیک وقت پر تشریف لائے، لیکن یہ اُن کی خموشی کا دِن تھا اس لیے صدارت کے فرائض ڈاکٹر سید محمود صاحب نے ادا کیے۔ گاندھی جی کا ایک مختصر تحریری بیان شری من ناراین جی اگروال نے پڑھ کر سنایا جس میں ہندوستان کے لیے عام اور مشترک زبان ''ہندوستانی'' کی ضرورت بتاتے ہوئے ناگری اور اردو دونوں رسم خطوں کے سیکھنے کی اپیل کی گئی تھی۔

ڈاکٹر محمود صاحب اور مولانا سید سلمان ندوی نے اپنی اپنی تقریر میں گاندھی سے اتفاق کیا۔ کیفی دہلوی صاحب نے کہا کہ گاندھی جی کے اس جملے سے کہ ''اب میں صرف ہندی یا صرف اردو کی حمایت کے حق میں نہیں ہوں'' سارا مطلع صاف ہوگیا ٹھاکر پرتھی سنگھ (الہ آباد) نے گاندھی جی کی حمایت میں اپنی عقیدت کا خراج پیش کیا۔

۲۷ رفروری ار بجے دن کو دوسرا اجلاس ڈاکٹر سید محمود کی صدارت میں شروع ہوا اس اجلاس میں ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے بھی شرکت کی جو کچھ دیر پہلے بمبئی سے آ گئے تھے۔

مسٹر ونکٹر اؤ نے فرمایا کہ وہ کل سے اس جلسے کی تقریریں سن رہے ہیں۔ مولانا سید سلیمان ندوی اور اردو کے دوسرے ادیبوں نے سادہ زبان میں اپنے خیالات ظاہر کیے جب کہ ٹھاکر پرتھی سنگھ اور ہندی کے بعض زبان والوں نے سنسکرت سے بوجھل زبان میں تقریریں کیں۔

''بھارتیہ ساہتیہ پریشد ناگ پور کے جلسے ۱۹۳۶ء کا حوالہ دیتے ہوئے آپ نے کہا کہ اس جلسے میں ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے بڑی منصفانہ بات کہی تھی کہ کانگریس ہی کی تجویز کے مطابق ملک کی عام اور مشترک زبان کا نام ہندوستانی برقرار رکھا جائے، لیکن گاندھی جی نہ مانے اور انہوں نے ''ہندی ہندوستانی'' کو جنم دیا۔

اسی روز دوپہر کے کھانے کے بعد تیسرا اجلاس گاندھی جی کی صدارت میں شروع ہوا چونکہ اب ''ہندوستانی پرچار سبھا'' کے روح رواں گاندھی جی ہی ہیں اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی تقریر کے بعض جملے جو اصل موضوع سے متعلق ہیں۔ انہی کے لفظوں میں یہاں لکھ دیے جائیں۔

''ہندوستانی سبھا'' کا مطلب ہے کہ ہندوستانی بنانے آئیں گے تو دونوں لپیاں (رسم خط) سیکھیں اردو اور ہندی یا ناگری۔ میں تو سمجھتا تھا کہ اردو کی فارسی لپی ہے، لیکن اب میں نے

سمجھ لیا ہے کہ یہ اردو لپی ہے یہ ہماری کم نصیبی ہے کہ جو ایک زمانے میں ہندوستانی تھی ۔۔۔۔لیکن ہم میں اب ایسی بات ہوگئی ہے کہ دو بولیاں الگ الگ ہوگئی ہیں ایک کہتے ہیں کہ ہم ہندی بولنے والے ہیں اور ناگری ہماری لپی اور دوسرے کہتے ہیں کہ اردو بولنے والے ہیں۔

۔۔۔۔تو یہ بات چلنے والی نہیں ہے وہ پڑھے لکھے لوگ ہیں۔ دیہات والوں کو تو روٹی کی فکر ہے وہاں کے لوگ ایک ہی زبان بولیں گے تو اس کا نام ہندوستانی ہے۔۔۔۔ ہندوستان میں رہنا ہے اور کسی پر زبردستی نہیں کرنا چاہتے تو آپ کو دونوں لپیاں سیکھنی چاہیں۔''

گاندھی جی کی تقریر کے بعد ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے تقریر فرماتے ہوئے کہا کہ

> ''میں ایک عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اب سے دس برس پہلے (بھارتیہ ساہتیہ پریشد ناگ پور ۱۹۳۶ء) میں نے کہا تھا کہ ہندوستانی ہماری زبان ہو، لیکن میری یہ تجویز منظور نہ ہوئی اور اس طرح ہمارے دس سال ضائع ہو گئے دس سال ضائع نہیں ہوئے۔ بلکہ اب تو ملک کی حالت بالکل بدل گئی ہے، ہم اس وقت جو کام کر سکتے تھے اب مشکل ہے اردو کے متعلق مجھے کچھ عرض کرنا ہے یہ عام لوگوں کی زبان تھی بازاروں اور گلی کوچوں میں بولی جاتی تھی۔ علم والے اس سے نفرت کرتے تھے کوئی اسے لکھنا بھی پسند نہیں کرتا تھا۔ یہ زبان بازاروں سے غریبوں کے جھونپڑوں سے زبردستی لوگوں کے گھر میں گھس گئی اور خاص لوگوں میں پہنچ گئی۔ امیروں نے اس سے نفرت کی بادشاہوں نے بھی اسے منہ نہ لگایا۔ بہادر شاہ کے ہاں بھی فارسی ہی میں پورا کاروبار تھا۔۔۔۔ ناگ پور میں بھی میں نے عرض کیا تھا کہ اردو ہندی کے محاورے زیادہ ہیں میں اردو کی لغت لکھ رہا ہوں ہمارے ہاں ستر پچھتر فیصدی الفاظ کی بنیاد ہندی لفظوں پر ہے۔۔۔۔ ''ہندوستانی'' یہ لفظ بہت دنوں سے سن رہا ہوں،

لیکن کوئی نمونہ نہیں ہے آل انڈیا ریڈیو نے یہ سوال کیا کہ
ہندوستانی کیا ہے چھے آدمیوں کی تقریریں بھی ہوئیں، لیکن
ان سب کی زبان علاحدہ تھی آج اتنے دنوں کے بعد مجھے
ایک نمونہ ملا ہے اور یہ ست نراین جی (سیکرٹری دکھشنی ہندی
پرچارنی سبھا مدراس) کی تقریر ہے دکن والوں کا دماغ بھی
خوب چلتا ہے اور زبان بھی ــــ
اگرچہ اردو دِلّی اور آس پاس کی زبانوں سے بنی، لیکن
لٹریچر دکن والے لے کر آئے تھے مجھے خوشی ہے کہ آج ایک
دکن والے مدراس سے ہم کو ہماری زبان سکھانے آئے
ہیں۔ میں اُن کو مبارک باد دیتا ہوں۔''

اس اجلاس میں دو تجویزیں ہوئیں۔ ایک یہ کہ ہندی والے اردو لکھاوٹ سیکھ لیں اور اردو والے ہندی لکھاوٹ سیکھ لیں اور جو کسی کو بھی نہیں جانتے، وہ دونوں سیکھیں تا کہ ہندوستانی پڑھ اور سمجھ سکیں اور اس طرح ہندوستانی کا پرچار ہو سکے دوسری تجویز کے ذریعے گاندھی جی، ڈاکٹر تاراچند اور مولانا سید سلیمان ندوی کو اختیار دیا گیا تھا کہ وہ اور کچھ لوگوں کو شامل کر کے ایک کمیٹی جس کے اراکین کی تعداد پندرہ سے زیادہ نہ ہو، بنائیں اور پھر یہ کمیٹی مجوزہ ''ہندوستانی'' کی لغتیں اور قواعد وغیرہ بنائے۔ خرچ کا بیورا (اندازہ) کرے اور گاندھی جی کی منظوری لے اور انہیں اس کی کاروائیوں کی اطلاع دیتی رہے یہ تجویزیں پنڈت سندر لال جی نے پیش کیں۔ جن کی تائید مولانا سلیمان ندوی، مہاشہ سدرشن، ڈاکٹر تاراچند اور پنڈت بنارسی داس چترویدی وغیرہ نے کی۔

گاندھی جی نے آخر میں ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کی تقریر کا حوالہ دیتے ہوئے کہا:

''اب انہوں (مولوی صاحب) نے ایک بات کہہ دی ہے
اس لیے کفارہ تو کر لوں انہوں نے دہرایا ہے اسی وقت سمجھ
لیتا اور مان لیتا، لیکن میں بغیر سوچے سمجھے ہوئے تو کام کرتا ہی
نہیں ہوں تو میں سمجھا ہی نہیں۔۔۔ اب کہتا ہوں کہ ہندی کا
بھی بھلا ہوا اور اردو کا بھی، ڈاکٹر تاراچند نے ہم کو بتا دیا کہ
ہندوستانی موجود ہے، لیکن لوگ نہیں مانتے۔''

''ہماری زبان'' کے اسی شمارے میں ایک مضمون ''وردھا میں کیا ہوا؟'' کے عنوان سے (اسی مضمون کا ذکر پہلے بھی کیا گیا ہے)، اس مضمون میں اس کمیٹی سے اُصولی اختلاف کیا گیا ہے مضمون نگار لکھتا ہے (مضمون نگار کا نام درج نہیں) کہ '' گاندھی جی تجربے کار اور بہت ہی سیانے سیاسی لیڈر ہیں وہ سب کو ہاتھ میں رکھنا چاہتے تھے اس لیے ڈاکٹر تارا چند کی رائے کا انہوں نے محض ذکر کر دیا کیوں کہ اس سلسلے میں ان سے کام لینا ہے، مگر ہندوستانی کی تعریف وہی سامنے رکھی جو ہندی کے متعصب حامی اور اردو کے جانی دشمن ٹنڈن جی کی تحریک سے نیشنل کانگریس نے قرار دی۔

تعجب ہے ڈاکٹر تارا چند صاحب نے اپنا نصب العین کب اور کیوں بدل لیا؟ گاندھی جی معہ آل انڈیا انڈین نیشنل کانگریس اور بابو پرشوتم داس ٹنڈن تو یہ کہتے ہیں کہ ہندوستانی وہ زبان ہے جو شمالی ہند کے گانو میں بولی جاتی ہے اور ڈاکٹر صاحب اسے دہلی اور آگرہ اور ہندوستان کے ہر بڑے شہر سے منسوب کرتے ہیں۔ جب اُصولی اختلاف کی یہ صورت ہے تو اس کمیٹی کے کیا معنی ہیں اور اس کا کیا مصرف ہے جو ابھی وردھا میں بنائی گئی ہے؟ یہ سوال جو ہمیں حیرت میں ڈال رہا ہے۔''

علامہ کیفی دہلوی صاحب کا مضمون ''تین دن وردھا میں'' بہت اہم ہے اس مضمون سے ہم ایسے اقتباسات کو نقل کر رہے ہیں جن کا تعلق زیادہ تر کیفی صاحب کی ذات، گاندھی جی اور اس کانفرنس سے ہے اس مضمون میں بعض بہت دلچسپ انکشافات ہوتے ہیں۔ علامہ صاحب فرماتے ہیں:

> ''میری حیثیت اس بھرے مجمع میں شاید صرف ایک شخص کے سوا سب سے جداگانہ تھی باقی سب لوگ کانفرنس بلانے والوں کے ہم خیال تھے یا محض تماشائی میں تمہیدی بیان کے بعد اس کانفرنس کو عرض وغایت سے بحث کرنے والا تھا اور یہ واضح کر دینا چاہتا تھا کہ کانفرنس کے مقاصد کو عموماً اردو بولنے اور خاص کر انجمن ترقی اردو کس نظر سے دیکھے گی اس سلسلے میں مناسب سمجھا گیا کہ گاندھی جی کے اس پیغام کو سامنے رکھا جائے جو ابھی دو دن ہوئے انہوں نے بمبئی کی انجمن ترقی

اردو کو بھیجا۔ جس کا اجلاس ایک دن پہلے ختم ہوا تھا میں وہ پیغام پڑھ کر اس کی تشریح کرنے کو تھا اور یہ واضح کر دینا چاہتا تھا کہ مجھے وقت کا خیال آیا۔ چونکہ مجھے بہت سی باتیں اور نہایت اہم باتیں کہنی تھیں اس لیے میں معلوم کرنا چاہتا تھا کہ میرے کتنے منٹ باقی رہتے ہیں چنانچہ میں نے ڈاکٹر محمود سے پوچھا، پیش تر اس کہ وہ کچھ جواب دیں گاندھی جی نے گھنٹی بجادی میں اپنی جگہ آ کر بیٹھ گیا۔''

اسی مضمون میں علامہ کیفی آگے چل کر لکھتے ہیں:

''مہاتما جی نے میری تقریر کو وقت سے پہلے کیوں ختم کر دیا۔ جب وہ نہایت معقول اور دلچسپ طرز پر چل رہی تھی کیا اُن کو یہ اندیشہ تھا کہ میں اُن کی تحریک کی مخالفت کروں گا جب ایک ستم ظریف نے مجھ سے یہی سوال کر ہی دیا تو میں نے مسکرا کر کہا گاندھی جی کی نظر نہایت غائر ہے اس سے کہیں زیادہ جتنا آپ سمجھتے ہیں لوگوں میں چہ میگوئیاں تھیں کہ جب گاندھی جی جلسے کا انتظام ڈاکٹر سید محمود کے سپرد کر چکے تھے اور میرا سوال بھی ڈاکٹر صاحب ہی سے تھا تو گاندھی جی نے گھنٹی بجانے کا فرض کیوں ادا کیا؟ ایسوسی اٹیڈ پریس نے یہ غلط رپورٹ کیا کہ میں نے گاندھی جی سے پوچھا تھا اسی طرح میری تقریر جو کچھ اس نے رپورٹ کی اس میں اور دوسرے دن مولوی عبدالحق صاحب کی تقریر اور مولانا سلیمان ندوی کی تقریروں کے بعض حصوں کی رپورٹ میں بھی گڑ بڑ ہے۔۔۔ رپورٹروں نے ایسی تقریروں کا ذکر نہیں کیا جو ہندوستانی کے خلاف ہوئی تھیں نہ ایک صاحب کی ترمیم کا ذکر کیا گیا۔''

کانفرنس کے اختتام کے بارے میں علامہ اقبال صاحب نے لکھا کہ

''دوسرے دن مہاتما جی نے خود اپنے خیالات زیرِ بحث تحریک کی نسبت ظاہر فرمائے اور دو تجویزیں پیش ہوئیں جن کا ذکر اخباروں میں آچکا ہے۔ کانفرنس کا خاتمہ میری ایک نظم کے ساتھ ہوا یہ نظم نکھارِ اردو میں ہے اس میں عربی، فارسی، سنسکرت، انگریزی کا کوئی لفظ نہیں آیا ہے اس میں ملک کی عام حالت کا خاکہ کھینچا گیا ہے جب یہ شعر پڑھا گیا۔

نئی الجھنیں اور پڑتی ہیں آکر
یہ کیا گتھیاں آپ سلجھا رہے ہیں

تو معلوم ہوا کہ ایک طرف سے کانا پھوسی ہوئی کہ یہ کل کی گھنٹی کی گونج ہے مگر یہ ان کی غلط فہمی تھی وہ نظم میری پہلے کی ہے اس کانفرنس کے لیے نہیں لکھی تھی غرض کہ میں یکم مارچ کو دل چسپ تجربہ لے کر خیریت سے دہلی واپس پہنچ گیا یہ معما ہی رہا کہ اس پیغام کو اتنا طومار کیوں بنایا گیا۔''

علاوہ کیفی صاحب نے ''اردو کانفرنس بمبئی'' میں گاندھی جی کے جس پیغام کا ذکر کیا ہے اُس میں گاندھی جی ہٹ دھرمی کو قائم رکھتے ہوئے ہندوستان کے لیے ایک عام اور مشترک زبان کی ضرورت بتاتے ہوئے اردو کے ساتھ ہندی کو بھی ترقی دینے کی اپیل کی تھی اور یہ بات بھی واضح رہے کہ قائداعظم محمد علی جناح نے اپنے پیغام میں انجمن ترقی اردو (ہند) کی خدمات کا اعتراف کیا اور اردو کو چھوٹے براعظم ہندوستان کی واحد مشترک زبان قرار دیا تھا۔

''ہماری زبان'' (تاریخ اشاعت پہلی فروری ۱۹۴۶ء) کے مستقبل کالم ''افکار و واقعات'' میں گاندھی جی کی ایک تقریر کے چند اقتباسات نقل کیے گئے اور ساتھ ہی ان کا جواب بھی دیا گیا۔

گاندھی جی نے اپنے تعمیری پروگرام میں قومی زبان پر حسب معمول عجیب طرح سے اپنا خیال ظاہر کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

''ہمیں کل ہند یک جہتی کی خاطر ہندوستان کی زبانوں میں سے کسی ایک زبان کو لینا ہوگا جسے لوگ زیادہ سے زیادہ تعداد

میں بولتے ہیں یا سمجھتے ہوں اور جسے ان کے علاوہ دوسرے
لوگ آسانی سے سیکھ سکتے ہوں۔ یہ زبان بلا شک وشبہ ہندی
ہے اسے شمال کے ہندو مسلمان دونوں بولتے ہیں۔ جب یہ
اردو حروف میں لکھی جاتی ہے تو اردو کہلاتی ہے۔ کانگریس
نے اپنے مشہور رزولیوشن میں جو کان پور کے اجلاس
(۱۹۲۵ء) میں منظور ہوا تھا اسے ہندوستانی کا نام دیا تھا اس
وقت سے ہندوستانی کم سے کم اُصولاً راشٹر بھاشا (قومی
زبان) سمجھی جاتی ہے اصولاً کا لفظ میں نے اس لیے کہا کہ
کانگریس والوں نے بھی اس پر عمل نہیں کیا جیسا کہ چاہیے
تھا یہ قومی زبان ہر شخص کو زبان کی دونوں صورتوں کے سمجھنے اور
دونوں رسم خط کے لکھنے پر قادر کردے گی۔''

اس تعمیری پروگرام میں گاندھی جی نے طالب علموں کو نصیحتیں فرمائی ہیں۔ جس میں وہ فرماتے ہیں:

''ان کو (طالب علموں کو) قومی زبان ہندوستانی اپنی موجودہ
دہری صورت میں سیکھنی چاہیے یعنی زبان کی دونوں صورتیں
اور دونوں رسم خط، تاکہ جب ہندی یا اردو بولی جائے اور
جب اردو یا ہندی رسم خط میں لکھی جائے تو پورے طور پر سمجھ
سکیں۔

(امسرت بازار پترکا ۱۰ جنوری ۱۹۴۶ء)

گاندھی جی کا یہ بیان پڑھ کر ہمیں مسٹر اندو لال یاجنک کا یہ
قول یاد آتا ہے کہ گاندھی جی جب کوئی تجویز پیش کرتے ہیں
تو اپنے فرار کی صورت پہلے سے سوچ لیتے ہیں اس بیان میں
اوّل تو یہ فرمایا کہ وہ زبان جسے زیادہ سے زیادہ تعداد میں لوگ
بولتے اور سمجھتے ہیں اور جسے دوسرے آسانی سے سیکھ سکتے ہیں
وہ بلا شک وشبہ ہندی زبان ہے اس لیے یہی راشٹر بھاشا یعنی

قومی زبان ہے اس کی دوسری شق یہ فرمائی کہ جب اُسے اردو
حروف میں لکھتے ہیں تو اردو کہلاتی ہے یہ صریحاً غلط ہے مگر
ہندی جو آج کل کی راشٹر بھاشا کے نام سے موسوم کی جاتی
ہے اردو حروف میں لکھی جائے تو وہ ہندی ہی رہتی ہے اردو
نہیں ہوتی بعینہٖ جیسے اگر اس نام نہاد راشٹر بھاشا کو انگریزی
حروف میں لکھا جائے تو وہ انگریزی نہیں ہو جاتی۔ ہندی ہی
رہتی ہے آگے چل کر خود ہی زبان کی دو صورتوں اور رسم خط
کے سیکھنے کی تلقین کرتے ہیں اس سے صاف ظاہر ہے کہ
زبانیں بھی دو ہیں اور رسم خط بھی دو ہیں تو پھر قومی زبان ایک
کہاں رہی، طالب علموں کو بھی انہوں نے دونوں صورتوں
اور دونوں رسم خط کے سیکھنے کی نصیحت فرمائی ہے اگر زبان ایک
ہوتی۔ تو صرف دو رسم خط کافی تھے، لیکن چونکہ زبان ایک نہیں
اس لیے رسم خط کے علاوہ زبان کی دوسری صورت بھی سیکھنی
لازم قرار دی۔ اسی کو کہتے ہیں ''حق برزبان جاری۔''

''۱۹۱۷ء میں گاندھی جی نے اپنے فرزند دل بند دیوداس
گاندھی کو مدراس بھیجا تھا تاکہ وہ صوبہ مدراس میں ہندی کی
اشاعت کی بنیاد ڈالیں۔ چنانچہ وہاں ''ہندی پرچار سبھا'' قائم
ہوئی اور اس وقت سے اب تک برابر کام کر رہی ہے اب تک
اس پر پندرہ سولہ لاکھ روپیہ صرف ہو چکا ہے گاندھی جی نے
ہندی کو ہندوستان کی عام زبان بنانے کا بیڑا اُٹھایا تھا اور
اپنے مشن کی ابتداء مدراس سے کی جسے ہندی سے دُور کا
واسطہ نہ تھا غرض وہ تنازع جو صرف یو۔ پی اور بہار تک محدود
تھا۔ اس کی آگ سارے ہندوستان میں بھڑکا دی۔ ۱۹۳۶ء
میں اکھل بھارتیہ ساہتیہ پریشد کے جلسے میں جب ہندی اور
ہندوستانی کی بحث آئی تو گاندھی جی نے صاف کہہ دیا کہ میں

ہندی نہیں چھوڑ سکتا۔ اس جلسے میں انہوں نے ''ہندی ہندوستانی'' کا لفظ بھی ایجاد کیا چونکہ یہ ایک مہمل سی بات تھی وہیں ختم ہوگئی اور ہندی کا پروپیگنڈہ اسی زور شور سے جاری رہا جب ہندی کی جڑیں مضبوط ہوگئیں اور اس کی تنظیم مستقل طور پر عمل میں آگئی تو اس طرف سے نچنت ہو کر گاندھی جی نے ہندوستانی کی طرف توجہ فرمائی اور ہندوستانی پر چار سبھا قائم کی۔ سبھا تو قائم ہوگئی، لیکن زبان جس کی خاطر سبھا بنائی گئی تھی وہ نہیں تھی۔ اب وہ بنائی جا رہی ہے۔'' (۷)

''افکار و واقعات'' کا کالم اکثر علامہ کیفی دہلوی صاحب ہی لکھا کرتے (یاد رہے کہ کیفی صاحب ''ہماری زبان'' کے مدیر بھی تھے) ایک کالم ایسا بھی نظر سے گزرا جو مولوی عبدالحق صاحب نے لکھا اس کالم میں مولوی صاحب نے گاندھی جی اور ہندوستانی کا ذکر ذرا تفصیل سے کیا ہے۔ آپ نے لکھا کہ

''انڈین نیشنل کانگریس نے بھی اپنے آئین میں ہندوستانی ہی کو ملکی زبان قرار دیا۔ چند سال ہوئے جب بابو سمپورنانند (وزیر تعلیم یو پی) نے گاندھی جی سے اس بارے میں دریافت کیا کہ کانگریس کے اس رزولیوشن کا کیا مطلب ہے تو گاندھی جی نے فرمایا کہ ہم نے صرف زبان کا نام تجویز کیا تھا اور کوئی قید نہیں لگائی تھی اس جواب کی ہوشیاری کو ملاحظہ کیجیے اس میں ایک طرف تو گزشتہ سے تعلق بالکل منقطع کر دیا ہے اور دوسری طرف آئندہ کے لیے ہر قسم کے امکانات موجود ہیں اور یہ رزولیوشن جیسا کہ آپ نے اکھل بھارتیہ ساہتیہ پریشد کے اجلاس ناگ پور میں فرمایا: ''میں نے ہی بتایا تھا۔'' ایک قرن گزرنے کے بعد اس کی جو صراحت آپ نے کی وہ آپ ہی کا حق تھا۔ تصنیف را مصنف نیکو کند بیاں۔

۱۹۱۷ء میں گاندھی جی نے ہندی کے راشٹر بھاشا (قومی زبان) بنانے کا بیڑا اُٹھایا اور اس خلوص، انہماک اور زور و شور سے اس کی اشاعت کی ہندی کے بڑے بڑے جغادری پر چارک کو بھی ان کی گرد کو نہ پہنچے اور وہ فتنہ جو یو۔ پی تک محدود تھا۔ آگ کی طرح سارے ہندوستان میں پھیل گیا۔ بیس برس بعد جب ناگ پور میں زبان کے معاملے میں اختلاف ہوا (کیونکہ پریشد کے اجلاس میں بعض ایسے لوگ بھی شریک تھے جو ہندی کو راشٹر بھاشا نہیں مانتے تھے) تو ان کی جدت

پسند طبیعت نے ''ہندی ہندوستانی'' کا نیا لفظ گھڑا۔ لفظ ہی تو گھڑنا تھا اصل سے تو مطلب ہی نہ تھا، لیکن یہ ہندی ہندوستانی نہ چلی، چلتی کیونکر اس کی کوئی بنیاد ہی نہ تھی، لیکن وہ اس عرصے میں بھی برابر ہندی کے پھیلانے میں مصروف رہے۔

اس اثناء میں جب یہ اختلاف بہت بڑھا اور یہ خیال ہوا کہ یہ بڑھتے بڑھتے دوسری تمام تحریکوں پر چھا جائے گا تو پنڈت سندر لال صاحب نے گاندھی جی کو سمجھانا شروع کیا کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ اردو کی مخالفت سے ملک میں ایک بہت بڑی جماعت ان سے بدگمان ہو گئی ہے اور اس اختلاف کا انجام اچھا نہ ہوگا پنڈت جی نے اکھل بھارتیہ ساہتیہ پریشد کی کارروائی پر بھی ایک بہت پُر زور اور منصفانہ خط لکھا تھا جس میں انہوں نے اردو زبان کی حقیقت پر بحث کی تھی اور گاندھی جی کو ان کی غلطی پر آگاہ کیا تھا اب اُن سے ملے اور دوبارہ پہلے سے بھی زیادہ طویل خط لکھا اور جدید ہندی اور اردو کا مقابلہ کر کے بتایا کہ ملک کی زبان کون سی ہے اسکے بعد وہ برابر گاندھی جی سے ملتے رہے اور ہفتوں بعد مہینے دو دو مہینے سیواگرام میں رہ کر گاندھی جی سے زبان کے معاملے میں گفتگو اور بحث کرتے رہے۔ ڈاکٹر تارا چند بھی کئی بار ملے اور سیواگرام کئی کئی روز قیام کر کے اس معاملے میں گاندھی جی سے گفتگو کی اور ہندی اور اردو کی تاریخ اور موجودہ تحریک کے نشیب و فراز کو سمجھایا۔ ان دونوں صاحبوں کا کہنا تھا کہ گاندھی جی رضامند ہو جاتے تھے، لیکن ان کے مشیران کو پھر کوئی ایسی پٹی پڑھاتے کہ وہ آگے پیچھے ہونے لگتے تھے آخر ان دونوں صاحبوں کی کوشش رنگ لائے بغیر نہ رہی اور گاندھی جی خدا خدا کر کے ''ہندوستانی'' اختیار کرنے پر رضامند ہو گئے اور اس کے بعد انہوں نے ۴۲ء میں ہندوستانی پرچار سبھا قائم کی۔

یہ گویا قول کی تعبیر تھی کہ ہم نے صرف زبان تجویز کی تھی اور کوئی قید نہیں لگائی تھی اس وقت صرف زبان کا نام تجویز کیا تھا اب اتنی مدت کے بعد زبان بنانی شروع کی یعنی یہ الٹی گنگا بہائی کہ پہلے نام تجویز کیا اور اس کے بعد مسمّی کی تلاش شروع ہوئی آخر خدا خدا کر کے گاندھی جی کی عجیب و غریب ہندوستانی ہریجن سیوک میں تولد ہوئی یہ بچہ چشم بددور، عجیب ہیئت اور نرالی شکل و صورت کا ہے۔

سر خرس کا ہے خوک کا لنگور کی گردن

بہت بے مزہ اور بے جان زبان ہے اور اَن مل بے جوڑ لفظ ملا کے رکھ دیے ہیں۔ گاندھی جی کا دعویٰ ہے کہ وہ اسے چلا کر اور ہندوستان کی راشٹر بھاشا بنا کر رہیں گے آفریں ہے

اس ہمت پر،

یہ تو ہے گاندھی جی کی ہندوستانی۔۔۔۔۔۔۔۔'' (۸)

وہ ''ہماری زبان'' کے اسی شمارے میں (یعنی پہلی ستمبر ۴۶ء کے شمارے میں) چندر موہن لال لابنہ (راولپنڈی) کا ایک مراسلہ شائع ہوا۔ جس میں انہوں نے گاندھی جی کو اردو کش پالیسی سے روکا اس مراسلے میں احتجاج ہے مذمت ہے غصہ ہے ایک ہندو کا ''باپو'' کی اردو کشی کے خلاف، مگر ''باپو'' رکنے والا کہاں تھا۔

مراسلے کے چند اقتباسات ملاحظہ کیجیے:

''اردو زبان سے شغف رکھنے والے تعلیمی اداروں، کارکنوں اور اخبارات میں ___ غرض کہ ہر جگہ ہر مقام پر۔ گاندھی جی کی ''ہندوستانی زبان'' پر تبصرے کیے جا رہے ہیں۔ ابھی تک مجھے گاندھی جی کا ''ہریجن'' جو اردو زبان میں چھپتا ہے ___ دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ مگر اخبارات کے اقتباسات دیکھ کر دُکھ ہوتا ہے سوال یہ ہے کہ گاندھی جی ''ہندی'' ہی کو فروغ دینا چاہتے ہیں تو پھر ''ہریجن'' اردو زبان میں نکالنے اور اردو حروف کو آلہ کار بنا کر در پردہ ''ہندی ادب'' کی مناسب اور موزوں اشاعت کر سکیں۔ گاندھی جی اپنی سیاسی قیادت کی وجہ سے دینا بھر کی ممتاز ترین شخصیتوں میں شمار ہوتے ہیں ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں ان کی سیاست اور روحانیت کی وجہ سے ہمارے دلوں میں اُن کے لیے کتنی ہی عقیدت کیوں نہ ہو۔ ان کی اردو کش پالیسی سے ہمیں اُن سے رَتی بھر بھی ہمدردی نہیں۔

استفسار پر گاندھی جی کہہ سکتے ہیں ''اردو غیر زبان ہے یہ مسلمانوں کی زبان ہے اسے صرف انہی تک محدود ہونا چاہیے۔ مگر مہاتما گاندھی شاید بھول رہے ہیں کہ یہ زبان ترقی کی منازل و مدارج طے کرتی ہوئی آج بہ حیثیت مجموعی چالیس کروڑ ہندوستانیوں کی زبان بن چکی ہے۔'' (۹)

ایک مضمون کے یہ الفاظ میری نظر سے گزرے۔

> ''اردو زبان دراصل ہندو مسلم تہذیب کے ملاپ سے پیدا ہوئی ہے، لیکن کس قدر حیرت کی بات ہے کہ یہی آج مسلم لیگ کے ہاتھوں میں دوسری قومیت کے نظریے کی اشاعت کا آلہ کار بنی ہوئی ہے۔'' (۱۰)

جب گاندھی جی اور کانگریس والے اردو سے تعصب برت رہے تھے تو کیا برا تھا اگر اردو مسلم لیگ کے ہاتھوں دوسری قومیت کا ''آلہ کار'' بنی ہوئی تھی۔

اس دوہری قومیت کے تعصب پر اس وقت بھی کان دھرے جاتے جب گاندھی جی نے ہندی کو ہندوؤں کی زبان اور اردو کو مسلمانوں کی زبان قرار دیا (کانگریس والے گاندھی جی کی ہاں میں ہاں ملاتے رہے)

جب انہوں نے کہا:

''ہندو جو ملک کی خدمت کرنا چاہتے ہیں اردو لکھیں اور مسلم ہندی سیکھیں۔''

میرے مضمون کے سارے حوالے اس بات کی بشارت دے رہے ہیں کہ گاندھی جی نے اردو کش پالیسی کو اختیار کیا۔ دُکھ اس بات کا ہے کہ ایسا ''مہاتما'' نے کیا۔ ''باپو'' نے کیا۔

اس کے علاوہ میں گاندھی جی کی مخالفت میں کوئی لفظ نہیں کہوں گا اگر گاندھی جی نے اردو کے لیے ایسا رویہ اختیار نہ کیا ہوتا تو آج اُن کی عظمت اس سے بھی دوچند ہوتی۔

ہندوستان جہاں بہت سے مذاہب ہیں اور بہت سی زبانیں بولی جاتی تھیں (اور ہیں) وہاں صرف ہندو اور مسلمان کا جھگڑا؟ ہندی اور اردو کا جھگڑا؟ میرے خیال میں تو یہ سیاست کی کمان سے نکلے ہوئے تیر تھے جو پاکیزہ ذہنوں میں پیوست ہو کر انہیں تعصب زدہ کر گئے۔

○○○

حوالہ جات

۱۔ ''افکار و واقعات'' مطبوعہ پندرہ روزہ، ''ہماری زبان''، تاریخ اشاعت یکم فروری ۱۹۴۰ء۔

۲۔ ''اردو ۱۹۳۹ء میں'' (پہلی قسط) از میاں بشیر احمد بی۔اے (آکسن) ایڈیٹر ''ہمایوں'' لاہور، مطبوعہ پندرہ روزہ، ''ہماری زبان'' تاریخ اشاعت یکم فروری ۱۹۴۰ء۔

۳۔ ''اردو ۱۹۳۹ء میں'' (دوسری قسط) از میاں بشیر احمد بی۔اے (آکسن) ایڈیٹر ''ہمایوں'' لاہور، مطبوعہ پندرہ روزہ، ''ہماری زبان'' تاریخ اشاعت ۱۶ فروری ۱۹۴۰ء۔

۴۔ ''سیکرٹری کا بیان'' یہ انجمن ترقی اردو (ہند) کے سیکرٹری ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی ایک تقریر ہے یہ تقریر انہوں نے ناگ پور میں کی۔ مطبوعہ پندرہ روزہ ''ہماری زبان'' تاریخ اشاعت ۱۶ فروری ۱۹۴۴ء۔

۵۔ ''افکار و واقعات'' مطبوعہ پندرہ روزہ، ''ہماری زبان''، تاریخ اشاعت ۱۶ جنوری ۱۹۴۵ء۔

۶۔ ''افکار و واقعات'' مطبوعہ پندرہ روزہ، ''ہماری زبان''، تاریخ اشاعت ۱۶ فروری ۱۹۴۵ء۔

۷۔ ''افکار و واقعات'' مطبوعہ پندرہ روزہ، ''ہماری زبان''، تاریخ اشاعت ۱۶ اپریل ۱۹۴۶ء۔

۸۔ ''افکار و واقعات'' مطبوعہ پندرہ روزہ، ''ہماری زبان''، تاریخ اشاعت یکم ستمبر ۱۹۴۶ء۔

۹۔ مراسلہ بعنوان ''گاندھی جی اور ان کی ہندوستانی'' از چندر موہن لال لابہ (راولپنڈی) مطبوعہ پندرہ روزہ ''ہماری زبان'' تاریخ اشاعت یکم ستمبر ۱۹۴۶ء۔

۱۰۔ ''اتحاد کا اثر ہندوستان کی زبانوں پر'' از نوشتہ سیرل مودک، مطبوعہ پندرہ روزہ ''ہماری زبان'' تاریخ اشاعت ۱۶ جنوری ۱۹۴۶ء۔

تیسرا حصّہ

☆ اُردو کا المیہ

☆ مسعود حسین خاں کے چند اداریے

مہاتما جی نے کیا سوچا تھا؟
(زبان کے بارے میں)

"میں ہمیشہ تمہارے پاس رہوں گا نہیں، مگر تم میرے رخصت ہوجانے کے بعد میرے الفاظ یاد کرو گے ۔۔۔ عدم رواداری مذہب کی نفی ہے۔"

(۱۸ر دسمبر ۱۹۴۷ء)

مہاتما گاندھی کے ان دُکھ بھرے الفاظ کا سیاق وسباق کوئی سیاسی المیہ نہیں، زبان کا مسئلہ ہے جو آزادی ہند کے بعد ملکی سیاست کی طرح ایک نئی کروٹ لے چکا تھا، جس بیان کے اختتام پر مذکورہ بالا الفاظ آئے ہیں وہ یہ ہے:

"میں دو دفعہ ہندی ساہتیہ سمیلن کا صدر رہ چکا ہوں۔ اس وقت تو سمیلن قومی زبان کے متعلق میری کوششوں کا سواگت کرتی تھی، مگر اب کیوں وہ اس بات کو ناپسند کرتی ہے۔ کیا اردو اور ہندی کو ملا کر ایک زبان بنانے کی کوشش کر کے میں کمتر درجہ کا ہندو یا ہندوستانی ہو گیا؟ ۔۔۔ کیا وہ ایک کل ہندوستان کی خدمت کر سکتے ہیں۔ اگر اردو رسم خط اور اردو زبان کو اس سے خارج کر دیا جائے۔"

(۱۸ر دسمبر ۱۹۴۸ء)

ہندوستان کی سیاسی وحدت کی طرح "ہندوستانی" ایک ملی جلی، سنگم زبان، مہاتما گاندھی کے لیے ایک لسانی عقیدے کا حکم رکھتی تھی۔ اس عقیدے میں ان کی نیک نیتی اور سیاسی

فراست دونوں کا دخل تھا:

''راشٹر بھاشا دو نہیں ایک ہی ہو سکتی ہے، وہ سنسکرت بھری ہندی یا فارسی سے بھری اردو نہیں ہو سکتی ہے۔ وہ تو ہندوستانی ہی ہو سکتی ہے۔ جو دونوں کے سندر سنگم سے ہی بن سکتی ہے اور اردو یا ناگری کسی بھی لپی میں لکھی جا سکتی ہے۔''

(۱۰/اگست ۱۹۴۷ء)

گاندھی جی کی مادری زبان گجراتی تھی، لیکن ایک جگہ صاف لکھتے ہیں: ''وہ راشٹر بھاشا نہیں ہو سکتی۔'' یہ مراٹھی بھی نہیں ہو سکتی، یہ ہندی بھی نہیں ہو سکتی جیسا کہ ہندی ساہتیہ سمیلن والے چاہتے تھے:

''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قومی زبان کے متعلق یہ جھگڑا کھڑا ہو گیا ہے کہ قومی زبان کیا ہو۔ مجھ سے کہا گیا ہے کہ وہ ہندی ہو گی، جو دیوناگری حروف میں لکھی جائے گی، میں تو کبھی اس پر رضامند نہیں ہو سکتا۔ میں دو دفعہ ہندی ساہتیہ سمیلن کا صدر رہ چکا ہوں۔ میں ہندی یا اردو کا دشمن نہیں ہو سکتا، لیکن میں یہ سمجھ چکا ہوں کہ عوام کی زبان اور ہندوستان کی قومی زبان صرف وہی ہو سکتی ہے جو اردو ہندی کا مرکب ہو اور دیوناگری اور اردو دونوں رسم خط میں لکھی جائے۔''

(۲/اگست ۱۹۴۷ء)

گاندھی جی کا ہندوستانی کا تصور دراصل رابطے کی زبان کا تصور تھا۔ وہ ملک کی لسانی کثرت میں ایک وحدت کا سررشتہ تلاش کرنا چاہتے تھے۔ اُن کے خیال میں اس ملک کے رابطے کی زبان صرف ایک ہندوستانی زبان ''ہندوستانی'' ہی ہو سکتی تھی:

''میں انگریزی زبان کا اس کے اپنے مقام پر احترام کرتا ہوں، مگر وہ کبھی بھی ہندوستان کی قومی زبان نہیں ہو سکتی۔''

(۱۸/اکتوبر ۱۹۴۸ء)

گاندھی جی نے جس لسانی حقیقت کو اپنی سوجھ بوجھ سے پالیا تھا وہ بیس سال کے بحث

ومباحثے کے بعد آج قومی اتفاق رائے کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ تعلیمی ہو کہ نفسیاتی، سیاسی ہو کہ مالیاتی، انگریزی کسی لحاظ سے عرصے تک سرکاری اور تعلیمی زبان نہیں رہ سکتی۔ جو لوگ کہ لسانی ''بدستور'' کے قائل ہیں وہ نہ صرف جمہوریت کے تقاضوں اور ذمہ داریوں سے رُوگردانی کے مجرم ہیں۔ بلکہ ایک مخصوص تعلیمی طبقے کو برقرار رکھنے کے بھی ذمہ دار ہیں۔

مہاتما جی آزادی ملنے کے بعد صرف چند ماہ اور زندہ رہے۔ یہ چند مہینے اُن کے لیے انتہائی روحانی کرب کا زمانہ تھا۔ یہ اُن کی اخلاقی قوتوں کی آزمائش کا بھی زمانہ تھا۔ وہ اپنی جان ہتھیلی پر لیے کبھی تو نواکھالی کے دیہاتوں میں گھومتے اور کبھی دِلّی کی گلیوں میں۔ اُن کے پاس مسلسل احتجاجی خطوط آرہے تھے کہ وہ مسلمان اور اردو نوازی کیوں کر رہے ہیں، لیکن اُس مردِ حق کا ہر ایک کو جواب یہ تھا:

''انگریزی تو ایک غیر ملکی زبان ہے، اردو تو ایسی نہیں ہے۔ مجھے تو اس بات پر فخر ہے کہ اردو ایک ایسی زبان ہے جو ہندوستان میں پیدا ہوئی اور ہندوستانی زبان ہے۔''

(۱۸/ردسمبر ۱۹۴۷ء)

وہ اپنی زندگی کے آخری ایام میں ٹیگور کے اس گیت کے زندہ مظہر بن گئے تھے جس میں کہا گیا ہے کہ اگر رات سیاہ اور تاریک ہو اور ہر چراغ بجھ چکا ہو تو اپنے وجود کو مشعل بنا کر راستہ طے کر۔ اگر راہ میں تیرا ساتھ دینے والا کوئی بھی نہ رہے تو اپنی راہ تنہا چل!

شاعر کے اس استعارے کو اب ایک ستیہ گری کے سادہ الفاظ میں سنیے:

''مجھے اس بات پر ملامت کی جاتی ہے کہ میں ایسے مقاصد کے لیے جدوجہد کرتا ہوں جن کو کوئی تائید حاصل نہیں ہوتی اور اس طرح اپنی زندگی ضائع کرتا ہوں ـــ مجھے یہ خوشی یہ الزام قبول ہے کہ میں ایسے مقاصد کی تائید کرتا ہوں جن کو کوئی تائید حاصل نہیں ہوتی، لیکن میں اس الزام کو قبول نہیں کرسکتا کہ میں اپنی زندگی ضائع کر رہا ہوں ـــ

مجھ سے کہا گیا ہے کہ میں ہندوستانی زبان کو ہندی اور اردو رسم خط کے ساتھ مقبول بنانے کی کوشش کر کے گویا ریتے کی رسی

بٹ رہا ہوں۔ خصوصاً جب کہ پاکستان ایک مسلمہ حقیقت بن
چکا ہے۔ میں شدت کے ساتھ ان رائے سے اختلاف کرتا
ہوں۔"

(۱۳ر جولائی ۱۹۴۷ء)

(اداریہ ۵ر اکتوبر ۱۹۶۹ء)

ooo

ہندوستانی پرچار سبھا

ہندوستانی پرچار سبھا ایک مردِ درویش کا جلایا ہوا چراغ ہے جو لسانی عصبیت کے تند و تیز جھونکوں کے باوجود بمبئی کے دور دراز گوشے میں اب تک جل رہا ہے۔ اس چراغ کو مہاتما گاندھی نے ۱۹۴۵ء کے ایک ایسے پُرآشوب دور میں روشن کیا تھا جب ہندی ساہتیہ سمیلن اُن سے دست بردار ہو چکا تھا اور مہاتما جی ''ہندی اتھوا ہندوستانی'' کی اپنی ہمالیائی غلطی کو تسلیم کر چکے تھے۔ ان کی نظروں کے سامنے اب ایک ایسی کل ہند زبان ___ ہندوستانی کا تصور تھا جس کا جامۂ حرف دیوناگری اور اردو دونوں رسم خط بنائے جا سکتے تھے۔ ۱۹۴۵ء سے لے کر ۱۹۴۸ء اپنی شہادت تک، وہ مسلسل ہندوستانی کا پرچار کرتے رہے۔ اُن کے اس تصور کی حمایت کرنے والوں میں پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر راجیندر پرشاد، ڈاکٹر ذاکر حسین، کاکا صاحب کالیلکر، ڈاکٹر تاراچند، پنڈت سندر لال اور شریمتی پیرن بہن کیپٹن خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

جب گاندھی جی چلے گئے تو سیاسی محاذ پر اُن کے جانشین بہت سے نکل آئے، لیکن سماجی اور تہذیبی فلاح کا محاذ صرف ان لوگوں کے حصے میں آیا جو اُن کی اور چراغ کی مانند خاموشی سے جلنا جانتے تھے، ہندوستانی پرچار کی تحریک کا سرا دادا بھائی نوروجی کی پوتی شریمتی بہن کیپٹن نے اُٹھا لیا۔ ان کا انتقال ۱۹۵۸ء میں ہو گیا، لیکن وہ اس سے قبل اپنی دوراندیشی اور اَن تھک تگ و دو سے بمبئی میں کئی لاکھ کی مالیت کی ایک عمارت ہندوستانی پرچار سبھا کے ٹرسٹ کے طور پر قائم کر گئیں۔ ۱۹۶۲ء سے اس مرکز میں مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سنٹر اور ہندوستانی پرچار سبھا کے دفاتر قائم ہیں، جنہوں نے نئے بورڈ آف ٹرسٹیز اور اکیڈمک کمیٹی کی رہنمائی میں نئی سرگرمی سے ہندوستانی پرچار کے کام کا آغاز کر دیا ہے۔

ہندوستانی پرچار سبھا اب بھی ایک کھوئے ہوئے خواب کی تلاش میں ہے۔ گاندھی جی

کی طرح اور انہیں کے الفاظ ہیں، وہ بھی "ریتے کی رسی" بٹنا چاہتی ہے۔ اس کے کارکن بھی ایسے مقاصد کے لیے مصروف پیکار ہیں جنہیں بظاہر کوئی تائید حاصل نہیں، لیکن اُن کی نظریں اس لسانی سچ پر جمی ہوئی ہیں کہ ہندوستانی ہندی اور اردو دونوں سے زیادہ بڑی حقیقت ہے۔ یہ نہ تو سرکاری دفتروں میں ڈھالی جاسکتی ہے اور نہ ایسے دانش کدوں میں جو عوامی زبان کے دھارے سے کٹ چکے ہیں اور نہ ایسے دانش کدوں مین جو عوامی زبان کے دھارے سے کٹ چکے ہوں۔ یہ ہر لحظہ او رہر پل ڈھل رہی ہے۔ کانپور اور احمد آباد کی ملوں میں، بمبئی اور کلکتے کے بازاروں میں اور روڑکیلا اور بھلائی کے کارخانوں بھی جہاں لاکھوں کا اجتماع ہے، جہاں ملک کے ہر گوشے سے انسان جوق در جوق جمع ہو رہے ہیں اور اپنے لیے ابلاغ و ترسیل کا ایک نیا وسیلہ ڈھونڈ رہے ہیں۔ یہ ہندوستانی نہ صرف ہندوستان بلکہ ایشیا کی ایک زبردست لسانی قوت ہے۔ اس کی زد پر مشرق وسطیٰ و مشرق بعید دونوں ہیں۔ اگر یہ قیاس صحیح ہے کہ مستقبل میں بین قومی زبان کی حیثیت سے کوئی ایک زبان رائج نہیں ہو سکے گی بلکہ دنیا کے مختلف علاقوں میں مختلف زبانیں بین قومی زبانوں کے فرائض انجام دیں گی، تو اس میں شبہ کی ذرا بھی گنجائش نہیں کہ روسی، چینی اور عربی کے ساتھ ہندوستانی بھی ایشیا کی ان بڑی زبانوں میں ہوگی جو ایک سے زائد ملکوں اور علاقوں بھی بین قومی زبانوں کی حیثیت سے استعمال کی جائیں گی۔ اس کے لیے دیوناگری اور اردو (عربی، فارسی) رسمِ خط دونوں کا استعمال ضروری ہے۔ اس لیے کہ مشرقِ وسطیٰ میں اس کی ترویج صرف عربی رسم خط ہی کے ذریعے ہو سکتی ہے، جب کہ ہندوستان اور مشرق بعید میں دیوناگری کا عام ہونا یقینی ہے۔ ہندوستانی زبان آج بھی ہندوستان کی قومی حدود پار کر کے عدن، سنگاپور اور سواحل افریقہ کی بندرگاہوں میں بلا تکلف استعمال کی جاتی ہے۔

ایشیا کی ایک زبردست، اُبھرتی ہوئی لسانی قوت کو تنگ نظری اور تھڑدلی کا شکار بنا دینا، دراصل نئے سیاسی وسماجی عوامل کی جانب سے آنکھیں بند کر لینا ہے۔ اسی لیے اردو ہندی کی صف آرائی کو گاندھی جی اس ملک کی بدقسمتی سمجھتے تھے۔ اُن کی نظر دیوناگری اور عربی فارسی رسم خطوں کی تہ میں جو زیادہ بڑی حقیقت ہندوستانی کی ہے، اس پر جمی رہی، اردو، ہندی ایک ہی اصل کے فروغ ہیں۔ یہ ایک دوسرے کی حلیف ہیں، حریف نہیں۔ پھر یہ کہاں کی عقل مندی ہے کہ ایک آنکھ کو چشم نمائی کرے اور ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ کو کاٹ ڈالے۔

(اداریہ، ۲۲ر نومبر ۱۹۶۹ء)

اردو رسمِ خط

اردو رسم خط، عربی رسم خط کی توسیع شدہ شکل ہے۔ عربی رسم خط کا اطلاق جب پہلی بار فارسی زبان پر ہوا تو اس میں فارسی زبان کی صوتیات کے پیش نظر کچھ توسیعات کی گئیں۔ پ، چ، ژ اور گ اسی دَور کی یادگار ہیں۔ اس رسم خط میں مزید توسیع اس وقت ہوتی ہے جب اسے پہلی بار اردو کے لیے پندرہویں صدی عیسوی کے اوائل میں، دکن میں خط ثلث کی شکل میں استعمال کیا گیا۔ ہندوستان میں نستعلیق کا رواج سولہویں صدی کے شروع میں ہوا، ہند آریائی کوز (مڑی ہوئی) آوازوں کے لیے دو تین یا چار نقطے ایک یا دو (-) لگا کر ٹ، ڈ، ڑ کی صورتی خصوصیات کو نمایاں کیا گیا۔ ان کوز آوازوں کے لیے (ط) کی علامت کا استعمال فورٹ ولیم کالج کے مطبع سے ہوتا ہے۔ ۱۸۰۰ء کے بعد کے بعض مخطوطات میں نقطوں اور (ط) کا استعمال بیک وقت بھی ملتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ یہ رسم خط، خط سے زیادہ آرٹ ہے۔ جوں جوں اس کی توسیع ہند ایرانی زبانوں (سندھی، پنجابی، اردو) اور دیگر ترکی اور کشمیری جیسی زبانوں پر کی گئی۔ اُس میں بہت سی پیچیدگیاں پیدا ہوتی گئیں۔ موجودہ طباعت کے نقطۂ نظر سے اس رسم خط کی سب سے بڑی خامیاں اُسکے لاتعداد جوڑ اور چھوٹے مصوتوں کے لیے اعراب کا مسئلہ ہے۔ ایک اور بڑا مسلمہ ان حروف (ث، ص، ذ، ض، ظ، ط وغیرہ) کا ہے جن کے مماثل کوئی آواز اردو میں نہیں پائی جاتی اور جو محض عربی زبان کی پاس داری کی وجہ سے ہمارے حروف تہجی میں شامل ہیں۔

ٹائپ اور طباعت کے نقطۂ نظر سے دقتیں علاحدہ ہیں۔ نستعلیق کا پہلا ٹائپ فورٹ ولیم کالج میں ڈھالا اور استعمال کیا گیا۔ اس کے بعد نظام سرکار کی سرپرستی میں اس پر مسلسل تجربات حیدرآباد میں کیے گئے، لیکن کوئی ایسی تشفی بخش صورت نہ نکل سکی کہ اسے بڑے پیمانے پر رائج کیا جا

سکتا۔ لاتعداد جوڑوں کا مسئلہ الگ تھا۔ دائروں کی بیٹھک کی دقت علاحدہ تھی، غرض بار بار خطِ نسخ کے ٹائپ کی جانب مراجعت کرنا پڑتی تھی۔ اتفاق سے اس ٹائپ کی بھی اردو کے حسن پرستوں میں شدت سے مخالفت ہوتی چلی آئی ہے۔ لیتھو کی چھپائی پر سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ اُس سے صرف محدود تعداد میں کتابوں اور اخباروں کی چھپائی کا کام لیا جا سکتا ہے۔ آف سیٹ کی طباعت نے بعض ایسی دقتوں کو دُور کر دیا، لیکن اِن اصلاحات کے باوجود اردو رسم خط کا دارومدار انسانی ہاتھ پر رہا۔ جس کا عجز مشین کے مقابلے میں مسلم ہے، کیا اعتبار یکسانیت اور کیا با عتبار رفتار۔ محض اتفاق ہے کہ اردو کی بہت کم کتابیں ایک ہزار اور اردو کے بہت کم اخبار دس ہزار سے زائد چھپتے ہیں۔ درحقیقت اس بے چادری سے اردو طباعت کا بھرم قائم ہے۔

اردو رسم خط کی ان مشکلات اور خامیوں کے باوجود اردو کے لیے اس رسم خط کا قائم رکھنا ناگزیر ہے۔ اس کے کئی اسباب ہیں:

- ★ زبان اور رسم خط کا ایک گہرا تہذیبی رشتہ ہوتا ہے۔ اس کے یک لخت بدل دینے سے تاریخی وتہذیبی تسلسل کے منقطع ہو جانے کا امکان رہتا ہے، جیسا کہ ترکی میں ہوا ہے، اور وسط ایشیاء کی ترکی ریاستوں میں، جہاں عربی رسم خط کو ہٹا کر پہلے رومن جاری کیا گیا تھا اور اب روسی رسم خط کا رواج ہے۔
- ★ اردو کے لیے رومن رسم خط کی تجویز بھی اس وقت تک قابلِ قبول نہیں ہو سکتی جب تک اس خط پر ہندوستان کی تمام زبانوں کی جانب سے اتفاقِ رائے نہ ہو جائے۔ یہاں پر مسئلہ ''ہم'' اور ''صنم'' دونوں کے ڈوبنے کا ہے۔
- ★ اردو کے لیے ہندی رسم خط کی تجویز نہ صرف آئینی اعتبار سے خطرناک ہے، لسانی اعتبار سے بھی مہمل ہے۔ عربی فارسی الفاظ کے علاوہ اردو ہندی میں مابہ الامتیاز فرق رسم خط کا ہے۔ اسی فرق کی وجہ سے دستور ہند میں اردو کو ایک علاحدہ زبان تسلیم کیا گیا ہے۔ ہندی رسم خط میں لکھی جانے کے بعد یہ واقعی ہندی کی ایک شیلی (اسلوب) بن جائے گی اور اس کیعلاحدہ زبان شمار کیے جانے کا جواز ختم ہو جائے گا۔
- ★ رسم خط کے سلسلے میں متمدن اقوام تک کا میلان قدامت پرستی کی جانب رہا ہے۔ برناڈ شا کے عمر بھر کے تیر ونشتر اور مرنے کے بعد انگریزی رسم خط کے لیے عطیے کے باوجود، انگریز قوم صوتی اعتبار سے ایک سخت مردُود رسم خط کو اب تک رد نہیں کر سکتی

ہے۔ دانشور امریکہ سالہا سال زور مارنے کے باوجود اب تک اس رسم خط سے صرف (u) اور (e) کو ہی بعض جگہ سے ہلا سکے ہیں۔ کسی رسم خط کو لکھنے پڑھنے کی ایک عادت ہوتی ہے جس میں اُس کی مشکلات حل ہوجاتی ہیں، اکتساب زبان میں لسانی پیچیدگیوں پر اب تک بہت زیادہ زور دیا جاتا ہے، لیکن یہ بہت زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں۔

اس لیے اردو رسم خط ہماری تعلیم و ترقی یا دو زبان کی مباعت و اشاعت میں اتنا بڑا روڑا نہیں کہ ہم اس پر عمل جراحی کرڈالیں۔ یہی جامہ حرف میں عربی، فارسی زبانیں اپنا انداز قامت آج بھی دکھارہی ہیں۔ یہی ایک پڑوسی ملک میں بھی اردو زبان کے زیب تن ہے۔ روسی، چینی اور دیوناگری کے ساتھ یہ ایشیاء کا ایک ممتاز ترین رسم خط ہے۔ ہندوستان میں یہ اردو زبان کے لیے قدرتی تفصیل کا حکم رکھتا ہے۔ اردو کا تصور اس کے بغیر ناممکن ہے۔

(اداریہ یکم دسمبر ۱۹۶۹ء)

○○○

اردو ہے جس کا نام ۔۔۔۔

یہ اُس زمانے کی بات ہے جب داغؔ جوان تھا، جب حضرت دہلی کا فرمایا ہوا مستند تسلیم کیا جاتا تھا۔ جب اردو نے ابھی ابھی علی گڑھ تحریک کے دیوزادوں کے دم خم سے بلوغت کے زینے پر قدم رکھا تھا۔ نظم ہو کہ نثر اردو کا ایک معیار تھا۔ شاعری کی زبان کے لیے وہ دبستانِ دہلی و لکھنؤ کی جانب دیکھتی تھی۔ نثر میں سرسید، آزاد، نذیر احمد، حالیؔ، شبلی، سرشار اور شرر نے اسے ایک نئے طرز سے آشنا کر دیا تھا۔ بیسویں صدی میں انہیں معمارانِ نظم و نثر کی پیروی میں وہ ترقی کرتی رہی۔ صحافت نے اسے ایک خاص ڈگر پر لگایا۔ علمی زبان کا دامن نئی اصطلاحات سے پُر ہو گیا۔ اردو یونی ورسٹی (جامعہ عثمانیہ) قائم ہو گئی۔ شمال ہو کہ دکن، پچھم ہو کہ پورب، ہر خطے کے لکھنے والوں کے لیے اردو کا مرکز مقرر رہا۔ اس زمانے میں اردو سے زیادہ ہندوستان کی کوئی دوسری زبان معیاری نہ تھی۔ ہندی میں اردو اور سنسکرت کا ٹکراؤ تھا۔ بنگال میں ٹیگور کی ''پرچلت بھاشا'' اور کلکتے کے پنڈتوں کی ''سادھو بھاشا'' کا سنگرام چل رہا تھا۔ تلگو اور کنٹری کی قبلہ گاہیں ابھی تک معرضِ بحث میں تھیں۔ صرف اردو ایک ایسی زبان تھی جس کے مرکز کی جانب اُنگلی اُٹھا کر بتایا جا سکتا تھا کہ یہ ہے اردو کا گھر اور گہوارہ!

بیسویں صدی کے تیسرے اور چوتھے دہے میں، باوجود اس کے اردو کے مرکز پنجاب اور دکن جیسے دُور دراز علاقوں میں واقع تھے، اردو کے معیار اور اس کے روزمرہ سب کی نظر رہتی تھی۔ پریم چند اور پنجاب کے اہلِ قلم نے اس زمانے میں کالسانی تنوع پیدا کیا۔ پریم چند اُس کو شہر سے نکال کر دیہات کی کھلی فضا میں لے گئے۔ پنجاب کے ادیبوں نے اس میں نئی توانائی پیدا کی، تاہم اس زمانے میں بھی ادب، پنجاب کا ہو یا بہار کا، دکن کا ہو یا کشمیر کا ''اردو ہے جس کا نام'' کا بھرپور احساس رکھتا تھا۔ کم از کم اردو کے محاورے یا روزمرہ سے انحراف پر فخر نہیں کرتا تھا، عجز

تصور کرتا تھا۔ شاعری کی زبان میں بالخصوص کڑی گرفت رہی۔

اردو، مرکزیت اور بار کے اُس دَور سے آزادی کے بعد دفعتاً ایک لامرکزیت کے دَور میں داخل ہو جاتی ہے یہاں میں مرکزیت اور لامرکزیت کی اصطلاحیں سیاسی نہیں لسانی مفہوم میں استعمال کر رہا ہوں۔ ہر زبان کو اپنے دوران ارتقاء میں کئی باران مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ کشمکش کی نوعیت بالکل وہی ہوتی ہے جو

ع کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

میں پائی جاتی ہے جب زبان معیار اور سند کی گرفت میں ہوتی ہے تو وہ اُس کی مرکزیت کا دَور ہوتا ہے جب اس میں پھیلاؤ اور رنگارنگی میلان آ جاتا ہے۔ مقامیت اپنا رنگ جھلکانے لگتی ہے، کئی بولیوں اور کئی لہجوں کی رنگ آمیزی ہونے لگتی ہے، روزمرہ اور محاورہ بکھرنے لگتا ہے تو یہ اس کی لامرکزیت کا دَور ہوتا ہے۔

اردو اپنے دوران ارتقا میں کم از کم تین باران مراحل سے گزر چکی ہے۔ شمالی ہند سے گئی ہوئی دکن میں ''ہندوی'' نام کی یہ زبان پہلی بار معیار آشنا اس وقت ہوتی ہے جب وجہی، نصرتی اور ہاشمی کے یہاں اوّل اوّل ''زبانِ ہندوستان'' اور دکنی میں امتیاز کیا جانے لگا، اور دکن کا شاعر اس اعتماد سے بات کرنے لگا۔

ترے شعر دکنی کا ہے جگ میں ناؤں
نکو بھونت کر دُسری بولی ملاؤں

ولی کم وبیش اسی اعتماد کے ساتھ ۱۷۰۰ء میں جب دہلی پہنچے تو انہیں مشورہ دیا گیا کہ وہ اپنی زبان کو ''موافق محاورہ شاہ جہان آباد'' بنائیں۔ بالآخر شمال کے ایک منچلے شاعر نے دکنی زبان پر پھبتی کسی ہی دی۔

قائم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ
اک بات لچر سی بہ زبان دکنی تھی

اس سے قبل حاتم نے اپنے ''دیوان زادہ'' کے دیباچے میں لسانی نکات مرتب کیے اور مظہر جان جاناں نے اس کو ''موافق محاورۂ شاہجہان آباد'' اور ''فصحائے دہلی'' بنا دیا۔ میر نے اس معیاری زبان کی فضا کو بھرپور انداز میں محسوس کیا اور چھلک اُٹھے۔ ع

مستند ہے میرا فرمایا ہوا

دہلی کے برباد ہونے کی داستان اردو کی لامرکزیت کی داستان ہے تا آں کہ اودھی کے علاقے میں لکھنؤ کا نیا مرکز قائم نہیں ہو جاتا اور زبان دانی کے اسم با مسمیٰ ناسخ کا ظہور نہیں ہوتا۔ ناسخ نے اردو کو قواعد کے جکڑ بند میں کس لیا اور اردو کا ''بولی پن'' (اور شاید بھولا پن بھی) اس طرح ختم سا کر دیا کہ دہلوی شاعر (بہ شمول غالب) انگشت بدنداں تھے۔

۱۸۵۷ء کے بعد جب نئے حالات اور نئے تقاضوں کے زیر اثر اور پیشِ نظر اردو کی نئی سمتوں میں توسیع ہونے لگی تو اس کا دہلی اور لکھنؤ کی تنگنائیوں میں دم گھٹنے لگا۔ اردو کی مذہبی اور درسی نثر (میر امن) کے مصنفین نے اس کی توسیع کے خطوط پہلے سے متعین کر دیے تھے۔ تاہم ان شہروں کی مرکزیت کو سب سے زیادہ درہم برہم کیا ہے علی گڑھ تحریک اور علی گڑھ نے۔ سرسید نے دہلی سے نکل کر اردو نثر تحریر نہیں کی ہے بلکہ عدالتی اہل کاروں کی روانی اور بے ساختگی کے ساتھ نوک قلم سے نئے خیالات ٹپکائے ہیں۔ نذیر احمد نے دہلوی بن کر دہلی کی زبان میں قصباتی محاوروں کو داخل کیا اور پھر ''دِلّی وال'' کو یہ دھمکی دی کہ اگر تم مجھے نہیں اپناؤ گے تو اپنا ہی نقصان کرو گے۔ حالی، خالی رہے ہوں یا میدان پانی پت کی طرح پائمال، مآل کار میدان انہیں کے ہاتھ رہا۔ سرسید اور اُن کے رفقاء روایت شکن بھی تھے اور روایت ساز بھی۔ بہت جلد جدید شاعری اور جدید نثر کی زبان معیاری تسلیم کی جانے لگی، اور ایک زمانہ اُن کا پیرو بن گیا۔

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے۔ بیسویں صدی کی اردو مرکزیت کے اس نئے دَور سے گزر رہی تھی کہ آزادی کا انقلاب آیا اور اردو ایک بار پھر لسانی نراج اور انتشار سے دوچار ہو گئی ہے۔ زبان کے لیے لامرکزیت کوئی خطرناک بات نہیں، بشرطیکہ اس کو توانائی اپنے محور سے حاصل ہوتی رہے۔ خاص طور پر اردو زبان جس کی تگ و تاز، پنجابی، بھوج پوری، بہاری بولیوں اور کشمیر و دکن کے دور دراز علاقوں تک ہے۔ اتنے وسیع علاقے میں جب بھی کوئی زبان تعلیمی یا تہذیبی حیثیت سے استعمال کی جائے گی تو اُس کا تنوع، رنگارنگی اور لامرکزیت کی طرف میلان رکھنا ناگزیر ہے۔ خطرہ اُس بات کا نہیں کہ اردو لامرکزیت کا شکار کیوں ہو رہی ہے۔ خطرہ اس بات کا ہے کہ اردو کے تمام مراکز آج زوال کی زد پر ہیں۔ اس اعتبار سے دہلی کی حالت لکھنؤ سے بدتر ہے، لکھنؤ کی بہار سے اور بہار کی دکن سے۔ آج اردو کے ناولوں اور افسانوں میں مقامی بولیوں کا رنگ چوکھا ہو گیا ہے۔ اردو شاعری کی زبان جو خاصی روایت پسند رہی ہے اور جسے ترقی پسند ادب کی تحریک تک زیادہ متاثر نہیں کر سکی، آج اس کا بھی شیرازہ بکھر رہا ہے۔ افسوس اس بات کا نہیں کہ ہمارے

ناول نویس اور افسانہ نگار غیر معیاری زبان لکھ رہے ہیں، افسوس اس بات کا ہے کہ ہمارے شاعر غلط زبان لکھ رہے ہیں۔ اس میں جدت پسندی سے عجز زبان کا دخل زیادہ ہے۔

اردو زبان کی اس نراجی کیفیت میں وہ سیاسی عوامل بھی شامل ہیں جنہوں نے آزاد ہندوستان میں اس کی حیثیت کو یک لخت بدل دیا ہے۔ یوپی اور بہار میں اس کی جڑوں کو کاٹ دیا جانا، جامعہ عثمانیہ کے مرحوم ہو جانے کے بعد اُس میں علمی اصطلاحات سازی کے کام کا بند ہو جانا اور سب سے بڑھ کر اس کی ہم زاد ہندی کا سرکاری سرپرستی میں تیزی سے ترقی کرنا۔ ہندی اب وہ نہیں رہی جو ۱۹۴۷ء سے پہلے تھی۔ بعض ''مغلوبین اردو'' اس بات کے اب تک مقر نہیں اور بہت سے ''معصومین اردو'' اس حقیقت سے اب تک آشنا نہیں! آزادی کے بعد ہندی کے اثرات مسلسل اردو زبان میں نفوذ کر رہے ہیں۔ سیکڑوں سرکاری و دفتری اصطلاحیں اردو والوں کی نوک زبان پر آ گئی ہیں۔ اَن گنت ادبی و تہذیبی الفاظ اُن کی نوک قلم سے ٹپک رہے ہیں۔ غزل میں گیت کا مزہ آنے لگا ہے اور نثر پر ہندی کی بندی لگائی جانے لگی ہے۔

اردو کی لامرکزیت کے اِس دَور میں اسکے محور قدموں کے نیچے سے نکلے جا رہے ہیں، بالکل اسی طرح جیسے گرداب کے دُور اُفتادہ چکر قائم رہیں، لیکن اُس کی گرہ کھل جائے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ زبان کے دریا میں معیار کے بھنور پھر کیوں کر پیدا ہوں گے۔ ٹکڑوں سے آئینہ پھر کیسے بنے گا۔ اردو کی لامرکزیت کا یہ دَور کب اور کہاں ختم ہو گا!

(اداریہ، ۸ر دسمبر ۱۹۶۹ء)

○○○

اردو بنام ہندی

اردو، ہندی ایک ہی شاخ کے دو پھول ہیں۔ اس کا ہندی نام، اردو سے زیادہ پرانا ہے۔ اس کا اردو اسلوب، ہندی سے زیادہ قدیم ہے، ایک قدیم ہندوستان کے لسانی تسلسل کی امین ہے، دوسری قرونِ وسطیٰ کے ہندوستان کی نمائندہ ہے۔ ہندی کے ساتھ مراٹھی، بنگالی، گجراتی میں سنسکرت قدرے مشترک ہے۔ اردو کے ساتھ کشمیری، سندھی اور پنجابی میں عربی، فارسی عناصر اشتراک کا کام دیتے ہیں۔

از منہ وسطیٰ میں فارسی، سرکاری و تہذیبی زبان تھی۔ اٹھارہویں صدی عیسوی تک رفتہ رفتہ یہ مقام اور منصب اردو کو حاصل ہوتا گیا۔ ۱۸۰۰ء کے اُفق پر کھڑے ہو کر زبان کا مورخ یہ کہہ سکتا ہے کہ پنجاب تا بنگال اور کشمیر تا دکن ادبی اور تہذیبی زبان کی حیثیت سے اردو زبان ہی لسانی کثرت میں وحدت کا سر رشتہ تھی۔ اودھی اور برج بھاشا کا دَور ختم ہو چکا تھا۔ کھڑی بولی ہندی نے ابھی تک ٹھیک سے جنم بھی نہیں لیا تھا کہ زمانے نے کروٹ بدلی۔ ہندوستان کی سیاسی بیداری کے ساتھ بمبئی اور کلکتہ کے دروازوں سے ایک نیا قومی شعور داخل ہوا۔ پہلے بنگالی سنوری، پھر مراٹھی اور انیسویں صدی کے وسط تک کھڑی بولی ہندی کی لہر سارے شمالی ہندوستان میں پھیل گئی۔ آج سے ٹھیک سو سال قبل اس لہر سے سرسید کا پہلا سابقہ بنارس میں ہوا تو اُن کا قومیت پر ایمان متزلزل ہو گیا۔ جوں جوں قومی تحریک کی لے بلند ہوتی گئی، گردشِ ایام پیچھے کی طرف دوڑنے لگی۔ فارسی پردیسی تھی ختم ہو گئی، اردو دیسی ہونے کے باوجود اجنبی دکھائی دینے لگی۔ ابتداء میں دیوناگری لپی پر زور تھا، آخر کار سنسکرت الفاظ کو ترجیح دینے کا رجحان فتح یاب ہوتا گیا۔ انڈین نیشنل کانگریس نے بیسویں صدی میں کچھ دنوں تک ہندوستانی اور اردو دونوں لکھاوٹوں کی آڑ لی، لیکن یہ پردہ بھی زیادہ دنوں تک کام نہ دے سکا۔ مہاتما جی اس راہ کے تنہا مسافر رہ گئے۔ بالآخر آزادی کے ساتھ

ہندی بصد ناز آئی، اور اردو کو ہندی کی ''شیلی'' کہہ کر اُس کے گھر میں بے گھر کر دیا گیا۔ اسکولوں سے اردو خارج کر دی گئی۔ سرکاری دفتروں سے اسے دھکیل دیا گیا۔ علی گڑھ جیسے شہروں کے ریلوے اسٹیشنوں سے اردو کے سائن بورڈ غائب ہونے لگے۔ ہندوستانی اکیڈمی (الہ آباد) ہندی اکیڈمی بنا دی گئی۔ لے دے ہوئی تو ایک کلاس میں دس اور ایک اسکول میں چالیس اردو طلبا کا فارمولا بنایا گیا، لیکن کسی کلاس میں نو کے بعد دسویں طالب علم کو داخلہ نہ مل سکا اور کسی اسکول میں انتالیس کا ہندسہ چالیس نہ بن سکا کہ اردو کے تعلیمی حق کی مانگ کی جا سکے۔ ناچار اردو والوں نے اپنا مقدمہ صدر جمہوریہ ہند کی عدالت عالیہ میں دائر کیا۔ کئی لاکھ دستخطوں سے محضر پیش کیا گیا۔ عین اس وقت جب اردو کے سربرآوردان صدر جمہوریہ سے چارہ جوئی کر رہے تھے، ریاست اُتر پردیش کی کانگریس کمیٹی، غالب کے شہر آگرہ میں یہ ریزولیشن پاس کر رہی تھی کہ اُتر پردیش کی سرکاری زبان ہندی، اور صرف ہندی ہوگی۔ یہ تیر بھی خالی گیا اور اردو والوں کی صدا مصلحت آمیزی کے اتھاہ سکوت میں گم ہو گئی۔ جب قومی سطح پر ____ لسانی فارمولا تجویز ہوا تو پنڈت نہرو کی صراحت اور وضاحت کے علی الرغم ہندی کی ریاستوں نے سنسکرت کی تیسری زبان قرار دے کر ہر طالب علم کو ہندی، انگریزی اور سنسکرت پڑھنے پر مجبور کر دیا۔ یہ صورت حال کم و بیش جاری ہے۔ ایک نئی تلوار جو اردو والوں کے سروں پر لٹکنے والی ہے۔ ہندی ریاستوں کے وزراء اور یونیورسٹیوں کے وائس چانسلروں کا حال کا فیصلہ ہے کہ ۱۹۷۲ء کے تعلیمی سال سے اُن ریاستوں کی تمام یونیورسٹیوں میں ہندی ذریعہ تعلیم کر دی جائے۔

اردو، ہندی کا مقدمہ دراصل تاریخ کے دو اَدوار کی روبکاری ہے۔ یہ ایک ہی زبان کی دو شکلوں کی کشمکش ہے۔ دونوں جانب بے اعتمادی کی فضا ہے۔ اردو والے اب تک تقسیم ہند کے بعد کے بدلے ہوئے حالات سے اردو کے مؤقف کو ہم آہنگ نہیں کر سکے ہیں۔ انہیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اردو ایک لسانی اقلیت کی زبان ہے جو بے طرح ملک کی مختلف ریاستوں میں منتشر ہے۔ اس کے بولنے والے دو کروڑ تینتیس لاکھ (۱) کی بڑی تعداد میں ہوتے ہوئے بھی ہندوستان کے کسی ضلع میں اکثریت کی حیثیت نہیں رکھتے۔ ایسی صورت میں اردو بولنے والوں کا دولسانی بننا ناگزیر ہے، یہ لسانی اقلیتوں کا مقدر رہتا ہے۔ جمہوری نظام میں اس مقدر کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا

---

(۱) ۱۹۷۱ء کی مردم شماری کے مطابق یہ تعداد دو کروڑ ۸۶ لاکھ ہو گئی ہے۔

لازمی ہے۔
لیکن دولسانی ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اپنی مادری زبان، اُس کے ذریعۂ تعلیم کا ترک کر دیا جائے، ہندی والے آزادی کے ابتدائی زمانے میں اردو کو حریف توانا سمجھ کر اُس سے خائف تھے۔ بعض سمجھ دار لوگوں تک کا خیال تھا کہ تقسیم ملک کے بعد اردو کا مقدمہ خارج ہو جانا چاہیے اور اس زبان کو اس ملک سے ہجرت کر جانا چاہیے۔ وہ اسے مانع قومی یک جہتی بھی کہنے لگے تھے۔ اُن کے نزدیک قومی یک جہتی عبارت تھی، ہندی اور ہندوستان قدیم سے۔ رفتہ رفتہ جوں جوں حالات سدھرتے گئے یہ بات روشن ہوتی گئی ہے کہ ہندوستانی قومیت تاریخ یا فرقہ واریت کی تنگنائیوں میں محصور نہیں کی جا سکتی۔ تامل ناد کی لسانی بغاوت نے ان پر روشن کر دیا کہ ہندوستان کی سب زبانیں مقدس ہیں اور سب قومی (راشٹری) ہیں۔ ہندی کی تخصیص صرف اس قدر ہے کہ یہ ہندوستان کی سب سے بڑی زبان ہے۔ ہندی والے انگریزی کو جس قدر جلد دیس نکال دینا چاہتے تھے، وہ بھی ممکن نہ ہو سکا، اس لیے کہ اس کو پاسبان خود صنم خانے سے مل گئے۔ ۱۹۶۷ء کے عام چناؤ سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ سیاست دان رائے عامہ کی زد سے باہر رہ کر ہمیشہ من مانی نہیں کر سکتے۔

کہا جاتا ہے کہ تہذیبی و سماجی بلوغت کے لیے کم از کم نصف صدی کی مدت درکار ہوتی ہے۔ اس بلوغت کے آثار پیدا ہو چلے ہیں۔ اردو والے اپنی زبان کے بارے میں حقیقت پسندانہ انداز میں سوچنے لگے ہیں اور ہندی والے بھی اردو زبان اور ہندی قومیت کے بارے میں اپنی رائے بدلنے پر مجبور ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ پچھلے دو دہوں میں، ہندی ریاستوں میں اردو کے تعلیمی نظام کو جو نقصان پہنچ چکا ہے اس کی تلافی کی جائے۔ ریاستی وزارتِ تعلیمات کے اندر اردو تعلیمی نظام کے صیغے کھول دیے جائیں جو اردو اسکولوں اور کالجوں کے قیام، درسی کتب کی تیاری اور اساتذہ کی تربیت کی جانب اسی طرح توجہ دیں جس طرح ہندی کے لیے دی جاتی ہے۔ ان اسکولوں اور کالجوں کے فارغ التحصیل طلبہ کے لیے سرکاری و کاروباری معیار کی ہندی کا جاننا لازمی قرار دیا جائے، لیکن تعلیم کا ذریعہ اردو رہے۔

ہمارے دستور میں پسماندہ طبقات کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے۔ آج ایسے طبقات کی خاطر اُس کی دفعات میں ترمیمیں کی جا رہی ہیں۔ اردو لسانی اقلیت کو لکد کوب زمانے نے کچھ اسی قسم کا بنا دیا ہے یعنی پسماندہ تر۔ کیا مرکزی سرکار یا دستور ہند انہیں رجعت، پسندانہ ریاستی قیادت

کے رحم وکرم پر مستقل طور پر چھوڑنا پسند کرے گی؟ کیا ہندی والے، تامل والوں کی یہ چنوتی انگیز کر سکیں گے کہ جب تم اپنے گھر میں اردو کے ساتھ انصاف نہ کر سکے تو کل ہند سطح پر ہمارے ساتھ کیا انصاف کرو گے؟ افسوس اس بات کا ہے کہ جس علاقے پر ہندوستان کی قیادت کا بار امانت ہے وہ معاشی اور سیاسی اعتبار سے سب سے زیادہ پسماندہ اور تہذیبی ولسانی لحاظ سے بے حد رجعت پسند ہے۔ نیا سال دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔ یہ دیکھئے عشاقِ اردو، بتانِ ہندی سے امسال کیا فیض پاتے ہیں۔ اردو کنونشن بمبئی کے پلیٹ فارم سے بہرحال ع

اِک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

(اداریہ، یکم جنوری ۱۹۷۰ء)

ooo

۱۹۷۱ء کی مردم شماری اور اردو

اعداد و شمار کی فصل پھر آ پہنچی ہے۔ ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کو دس سال ہو رہے ہیں۔ ۱۹۷۱ء اس کا نیا سال ہوگا، لیکن محکمہ مردم شماری کے ہرکارے اس سے بھی قبل آپ کا دروازہ کھٹکھٹا رہے ہوں گے۔ اُن کے ہاتھ میں تختہ سرشاری ہوگا اور وہ آپ سے کسی قدر تحکمانہ انداز میں پوچھیں گے کہ آپ کی "ماتر بھاشا" کیا ہے؟ آپ گڑبڑائیں گے تو پھر کہیں گے، جلد بولئے! ہندی، ہندوستانی یا اردو؟ ممکن ہے کہ اُن کے لہجے کے اُتار چڑھاؤ یا آپ کے دام شنیدن کے پھیلاؤ میں اردو کا لفظ اُلوپ ہو جائے اور آپ صرف ہندی یا ہندوستانی ہی سنیں اور اتمام حجت کے لیے "ہندوستانی"! کہہ بیٹھیں۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اردو کے اعداد و شمار سے ایک خاندان غائب ہو جائے گا۔ اس لیے آپ کو اردو زبان کے لہجے کی پوری توانائی کے ساتھ کہنا ہوگا کہ میرے خاندان کی زبان اردو ہے۔

مردم شماری کے وقت ہر شہری کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی مادری زبان جس بولی یا زبان کو چاہے درج کرا سکتا ہے، اور اندراج کرنے والوں کا یہ فرض ہے کہ مادری زبان کی حیثیت سے صرف وہی زبان لکھیں جو لکھوائی جائے۔ ۱۸۸۱ء سے ہندوستان کی مردم شماری کی رپورٹوں میں لوگوں کی مادری زبان کا اندراج ہوتا آیا ہے۔ ۱۹۱۱ء کی رپورٹ سے اُن کی تفصیلات باقاعدہ جدولوں کی شکل میں تیار کرائی گئی ہیں۔ مادری زبانوں کی فہرست میں صرف مستند زبانیں ہی شامل نہیں بہت سے لوگ غیر معمولی بولیوں تک کو اپنی مادری زبان لکھواتے آئے ہیں۔ بعضوں نے یہ شرف سنسکرت تک کو بخشا ہے اور انگریزی کو مادری زبان درج کرانے والوں کی تو ہمیشہ خاصی تعداد رہی ہے۔ البتہ بے چاری اردو کے ساتھ ان تمام رپورٹوں میں کچھ نہ کچھ لطیفہ سنگین ہوتا آیا ہے۔ غلام ہندوستان میں بھی اور آزاد ہندوستان میں بھی۔ اس ستم ظریفی کی بنیاد لفظ "ہندوستانی" ہے

خدا رحمت کرے اس شیر پر جس نے زبان کے اس نام کو مردم شماری میں رائج کیا کہ آج یہ ہماری زبان سے کمبل بن کر لپٹ گیا ہے اور اس زبان پر کمبل ڈالنے والے اس من مانے طور پر استعمال کرتے آئے ہیں۔ مثلاً اُتر پردیش کے (کہ اس کی علاقائی سالمیت ۱۹۱۱ء سے برقرار ہے) اعداد و شمار کی جدول ہی کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اردو، ہندوستانی کی لپیٹ میں کب تک رہی ہے اور ۱۹۶۱ء کی مردم شماری میں جب اس کے چکر سے نکلی تو اردو بولنے والوں کی تعداد، بلا داد و امداد کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ ۱۹۱۱ء کی مردم شماری میں ہندی، اردو کی تقسیم حسبِ ذیل تھی:

ہندی: ۴۳ ، ۷۶۵ ، ۶۵۹

اردو: ۴ ، ۰۹۵ ، ۷۲۸

۱۹۲۱ء، ۱۹۳۱ء اور ۱۹۵۱ء کی رپورٹوں میں جب ''ہندوستانی'' کی پچر لگا دی گئی تو نقشہ حسبِ ذیل ہوگیا۔ (۱۹۴۱ء میں جنگ کی وجہ سے مردم شماری نہیں ہوئی تھی)

	۱۹۲۱ء	۱۹۳۱ء	۱۹۵۱ء
ہندی	x	x	۵۰،۴۵۴،۲۱۷
ہندوستانی	۴۶،۳۸۹،۷۳	۴۹،۴۵۶،۳۲۷	۶،۷۴۲،۹۳۸
		(+۶.۶۱%)	(-۸۶.۳۷%)
اردو	x	x	۴،۳۰۰،۴۲۵

دوسرے الفاظ میں آزادی کے بعد جب ''ہندوستانی'' کا طلسم ٹوٹا اور اردو، ہندی کا جداگانہ حق انتخاب دیا گیا تو ہندوستانی میں ۸۶.۳۷ فی صدی کی یک لخت کمی ہوگئی۔ ۱۹۶۱ء کی مردم شماری سے اس کا مقابلہ کرکے بین السطور پڑھئے تو معلوم ہوگا کہ ۱۹۵۱ء کی مردم شماری میں ہندوستانی کو مادری زبان لکھوانے والوں کی بڑی تعداد اردو بولنے والوں کی تھی جو قومی یک جہتی کی دھمکی یا تھپکی میں آگئے تھے۔ ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق اُتر پردیش میں تینوں زبانوں کے اعداد و شمار حسبِ ذیل ہیں:

ہندی: ۶۲،۴۴۲،۷۳۱ (۲۳۰۷۶ فی صد اضافہ)

اردو: ۷،۸۹۱،۷۱۰ (۸۳۰۵۱ فی صد اضافہ)

ہندوستانی: ۱۰۰،۵۳۰ (۹۸۰۵۱ فی صد کمی)

اس طرح ۱۹۵۱ء میں ۶۷ لاکھ ہندوستانی لکھوانے والوں کی تعداد ۱۹۶۱ء میں گھٹ کر

۱۹۵۱ء کی مردم شماری میں ہندوستانی نام خاص طور پر ایسی ریاستوں کے لسانی اعداد و شمار میں ملتا ہے، جہاں بیشتر زد اردو پر پڑی ہے۔ مثلاً اُتر پردیش، آندھرا پردیش، میسور، مدراس (تاملناد) اور جموں و کشمیر۔ ان تمام ریاستوں میں اردو کے بولنے والوں نے ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کے وقت دھوکا کھایا تھا اور اردو، ہندوستانی میں تقسیم ہو گئے تھے۔ ۱۹۶۰ء کی مردم شماری کے وقت جب ہوش آیا تو ہر ریاست میں اُن کی تعداد میں حیرت انگیز اضافہ ہوا جس کے شرح اس طرح ہے:

(۱) اُتر پردیش:	۸۳۰۵۱ فی صد
(۲) آندھرا پردیش:	۵۹۰۶۴ فی صد
(۳) بہار:	۵۴۰۷۹ فی صد
(۴) مدھیہ پردیش:	۱۰۰۰۹۹ فی صد
(۵) میسور:	۱۳۱۰۷۶ فی صد
(۶) راجستھان:	۲۲۶۰۳۷ فی صد
(۷) گجرات:	۵۰۰۱۰ فی صد
(۸) تامل ناڈ:	۴۴۰۲۱ فی صد
(۹) مہاراشٹر:	۳۱۰۰۱ فی صد
(۱۰) اُڑیسہ:	۳۳۰۸۸ فی صد

۱۹۶۱ء کی مردم شماری میں اردو کے اعداد و شمار کی یہ بازیافت ادنیٰ سا کرشمہ ہے۔ اردو والوں کے لسانی شعور کا اور ہندوستانی کے ہم رنگ اردو دام سے باہر نکل آنے کا۔ ۱۹۷۱ء کی مردم شماری کے وقت بھی ہمارا لسانی شعور پوری طرح سے بیدار رہنا چاہیے۔ بہر حال جمہوریت اعداد و شمار کی بازی گری ہے۔ اگر اردو والے اپنی مادری زبان اردو لکھوانے میں تساہل یا گریز سے کام لیں گے تو کم از کم اگلے دس سال تک اُن کے قامت کی درازی انہیں اعداد و شمار سے پائی جائے گی۔ مردم شماری کو اصطلاحاً سر شماری بھی کہا گیا ہے۔ یاد رہے، جو سر شمار نہیں ہوگا، وہ قلم ہوگا!

(اداریہ، یکم فروری ۱۹۷۰ء)

○○○

دِل اور دے اُن کو۔۔۔۔

ہندی کے ایک موقر ہفتہ وار کے ایڈیٹر نے حال میں اردو کنونشن (بمبئی) پر تبصرہ کرتے ہوئے بعض ایسی تیکھی باتیں لکھی ہیں جو ایک طرف دانشوران ہندی کی غماز ہیں تو دوسری طرف اردو کے اُن داعیوں کے لیے، جو اُس کے مطالبے کو ''ہندوستان کی تمام زبانوں کی آواز'' قرار دیتے ہیں، عبرت کا تازیانہ بھی۔ ایڈیٹر موصوف، جو خود کو اردو کا سچا حامی قرار دیتے ہیں۔ چراغ پا اس بات پر ہیں کہ کنونشن میں اردو کی کچھ ریاستوں میں ثانوی زبان بنائے جانے کی تجویز کو پیش اور پاس کیوں کیا گیا۔ یہ اردو سے اُن کے پریم اور ہندی کی ''مریادا'' دونوں سے بعید ہے۔ اُن کی آواز محض ایک شخص کی آواز نہیں، اس میں سُر بعض ہندی کے ایسے ادیبوں کے بھی ملے ہوئے ہیں جو اردو کو سہولتیں اور مراعات دینے کے قائل ہیں اور اس سے قبل اردو کی تائید میں مختلف اپیلوں بھی کر چکے ہیں۔

ایڈیٹر موصوف کو اردو کنونش کی اس تجویز میں کہ اردو کو بعض ریاستوں میں ثانوی زبان کی حیثیت دی جائے، نہ صرف ایک سیاسی سازش نظر آتی ہے بلکہ ایک عیارانہ دروغ بانی بھی۔ اُن کا خیال ہے کہ اس سے، نہ صرف فرقہ وارانہ اشتعال پیدا ہوگا بلکہ خود اردو کے حق میں اس قسم کی مانگ مضر ثابت ہوگی۔ اُن کی دوستانہ رائے میں اردو والوں کی زبان اور رسم خط کے فرق کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ بڑی فراخ دلی ہے وہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ میر، نذیر اور غالب (اقبال نہیں؟) تبدیلی رسم خط کے ساتھ بھارتیندو اور میتھلی شرن گپت کے ساتھ پڑھائے جا سکتے ہیں اور ہندی ریاستوں کی سرکاری زبان کو ''دیوناگری میں لکھی جانے والی ہندی اردو'' بھی مانا جا سکتا

ہے۔ اُنہیں اس بات پر افسوس ہے کہ اردو تحریک بدنصیبی سے غلط ہاتھوں میں پڑ گئی ہے اور تاریخ کے ایک اہم موڑ پر ایک غلط سمت اختیار کر رہی ہے۔ اردو کو ثانوی سرکاری زبان بنانے کا ''ناجائز حق''، ہندی کے دانشور کبھی قبول نہیں کر سکتے۔ اس لیے بہتر ہے کہ اردو والے خود کو اس سازش کا شکار نہ ہونے دیں۔

ایڈیٹر موصوف کے علم میں شاید یہ بات نہیں کہ سیاسی سازش لسانی اقلیتیں ہی نہیں، اکثریت بھی کر سکتی ہے۔ سازش اسے نہیں کہتے کہ اپنے حق کے لیے منت سماجت سے قائل کیا جائے، سازش اسے کہتے ہیں کہ کسی زبان کی کھال اُدھیڑ کر اس کے ڈھانچے کو اپنانے کا ڈھونگ رچایا جائے یا شیکسپیئر کے کردار شائی لاک کے مانند جسم سے پاؤ بھر گوشت لے کر اُس پر حق و انصاف کا اطلاق کیا جائے۔ پچھلے دہے کے لسانی خلفشار اور ردِ عمل کے باوجود، وہ لوگ جو ہندی کو ہندوستانی قومیت کا جزوِ اعظم سمجھتے ہیں، ابھی تک وہیں ہیں جہاں پہلے تھے۔ اُن کا ایک قدم آگے، دو قدم پیچھے کا پیش خیمہ ہوتا ہے، ہندی ریاستوں میں اردو سے متعلق آزاد خیالی، سیاسی حالات کے دباؤ کا نتیجہ ہے۔ کیا دانشورانِ ہندی کی دفعتہً اردو کی حمایت کو بھی ہم اس پر محمول کریں؟ کیا ہندی ریاستوں میں اردو کو ثانوی زبان کی حیثیت دینے سے کوئی قیامت آجائے گی؟ کیا ان کو دستورِ ہند کی دفعہ ۳۴۷ کا بھی علم نہیں جس کی رُو سے اگر کسی ریاست کی معتدبہ آبادی کسی دوسری زبان کو سرکاری زبان بنانے کا مطالبہ کرے اور صدر جمہوریہ کو اس مطالبے کی صحت کا اطمینان ہو جائے تو اس کے دوسری سرکاری زبان بننے کا اعلان کیا جا سکتا ہے۔ اگر تمام ریاستوں کو ایک لسانی بنانا ہی منظور ہوتا تو دستور میں اس دفعہ اور گنجائش کی کیا ضرورت تھی؟ ہندی والے پنجاب میں ہندی کو ثانوی زبان بنانے پر اب تک مصر کیوں ہیں؟ اردو رسم خط کو رد کرنے کے بعد پنجاب میں اُن کے اس مطالبے میں کیا جان باقی رہ جاتی ہے کہ پنجابی کو گرومکھی اور دیوناگری دونوں لپیوں میں منظور کیا جائے۔ ظاہر ہے ہندی ریاستوں میں اردو ثانوی زبان بن کر بھی ہندی کی حریف نہیں ہو سکتی۔ پہلی اور دوسری زبان کا امتیاز بہر حال قائم رہے گا اور دو لسانی بننے کی ذمہ داری دوسری زبان بولنے والوں پر ہوگی نہ کہ پہلی زبان بولنے والوں پر۔

دراصل ہندی والوں کا ذہن لسانی اعتبار سے ابھی تک رجعت پسندی کا شکار ہے۔ بعض اوقات سیاسی دھچکے انہیں روشنی دیکھنے پر مجبور کر دیتے ہیں، لیکن بہت جلد وہ پھر تاریکی کی

آسودگی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس لیے اردو کے ''ہندی کرن'' کی تحریک بہر حال اقلیتوں کے ''بھارتیہ کرن'' منصوبے کا ایک جزو ہے! ہندی ہندوستان کی سب سے بڑی زبان ہے۔ اُس کا سیکھنا ہم سب پر واجب ہے، لیکن ہندی ہر ہندوستانی کی مادری زبان نہیں، اور نہ یہ واحد قومی زبان ہے۔ کاش ''انگریزی ہٹاؤ'' کی تحریک چلانے والے عناصر غیر مادری زبان کے تسلط کا احساس اپنی نسبت سے بھی کر سکتے!

ہندی ادیبوں میں اردو مطالبات کے اس ردِ عمل کی ذمہ داری اردو کے اُن خیر خواہوں پر بھی ہے جو اردو کے سلسلے میں گداگری اور سوداگری پر اُتر آئے ہیں۔ ہم اکثر اوقات اپنے مقدمے کو توڑ موڑ کر پیش کرتے رہے ہیں۔ بے یقینی کی عام فضا میں بعض گوشوں سے وقتاً فوقتاً یہ آواز بلند ہوتی رہی ہے کہ اردو کا رسم خط بدل کر دیوناگری کر دیا جائے یا اردو کو دیوناگری رسم خط میں بدل کر دوسری سرکاری زبان بنانے کی تائید حاصل کر لی جائے، یہ سمجھوتے قطعی طور پر ناسمجھی پر مبنی ہیں اور ان کی تہ میں لسانی سے زیادہ سیاسی شعور کارفرما ہے۔ ہندی ہفت روزہ کے ایڈیٹر نے اپنے اس بیان میں اس بات کی جانب اشارہ بھی کیا ہے کہ اردو رسم خط کو ترک کرنے کی تجویز ہندی والوں کی نہیں ہے بلکہ پہلی بار ۱۹۴۷ء کی ایک کانفرنس میں، جو الٰہ آباد میں منعقد ہوئی تھی، اردو کے بعض ادیبوں کی جانب سے پیش کی گئی تھی۔ اُس کے بعد ہی ہندی کے ادیبوں نے ''دیوناگری رسم خط میں ہندی، اردو'' کا فارمولا تسلیم کیا تھا۔

ہمیں حقائق کا دوبدو مقابلہ کرنا ہے۔ اردو والوں کے لیے وہ دن روزِ سیاہ کا مترادف ہوگا جب وہ اپنے بچوں کو دیوناگری کے ذریعے اردو پڑھائیں گے۔ تاریخ چشم براہ ہے کہ ہماری آئندہ نسلیں یا تو اردو، اردو کی طرح پڑھیں گی اور یا صرف ہندی پڑھیں گی۔ جو لوگ اردو رسم خط کا سودا اردو نام سے کرنا چاہتے ہیں وہ گھاٹے کا کاروبار کر رہے ہیں۔ کوئی بھی شخص اپنی کھال اُدھیڑ کر زندہ نہیں رہ سکتا۔

ہندی والے پچھلے دو دہوں میں مسلسل عقلیت اور ظلمت پسندی کی دُھوپ چھاؤں میں آگے بڑھ رہے ہیں۔ اس بات کی خوشی ہے کہ سایوں میں کرنوں کا برابر اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ آزادی کے فوراً بعد انہوں نے اردو کے وجود ہی سے انکار کیا تھا، کچھ عرصے کے بعد اسے ہندی کی شیلی بتانے لگے۔ پھر یہاں تک آ گئے کہ سرکاری زبان ''دیوناگری رسم میں ہندی، اردو'' مانے

لگے۔ کیا وہ ایک قدم اور آگے نہیں آئیں گے؟ غزل کی زبان میں ہم بہرحال دستِ بدعا ہیں ع

دل اور دے اُن کو جو نہ دے ہم کو زباں اور

(اداریہ، ۸؍فروری ۱۹۷۰ء)

○○○

اردو: علاقائی یا دوسری سرکاری زبان

کہا جاتا ہے کہ پانی کی سنسکرت قواعد ہندوستانی ذہن کی لسانیاتی ادب کو عظیم ترین پیش کش ہے۔ ہمیں یقین ہے جب یہ قول وضع کیا گیا تھا اس وقت دستور ہند کے سترہویں حصے کے وہ چار باب پیشِ نظر نہ تھے جن کا تعلق ''یونین کی سرکاری زبان'' اور متعلقہ مسائل سے ہے۔ ابہام وایہام کی یہ مجہول النوع دستاویز ہندوستانی سیاسی فطانت کا ایک ایسا شاہ کار ہے جس کی نظیر لسانیاتی ادب یا دستور سازی کی تاریخ میں ملنا ناممکن ہے۔ ان ابواب میں جن مسائل سے بحث کی گئی ہے وہ خالص لسانیاتی ہیں اور جس انداز اور نوع سے کی گئی ہے وہ سرتا سر سیاسی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ملکھم پن کا ایک ایسا جال سا بن گیا ہے جس سے ہمارا ہندوستان تا حال نجات حاصل نہیں کر سکا ہے۔ نہ تو مرکزی سرکاری زبان کا مسئلہ اب تک حل ہو سکا ہے اور نہ لسانی اقلیتوں کی زبانوں کا۔ اس کی مختلف دفعات کے ذریعے لسانی شیرازہ بندی کی جو کوشش کی گئی ہے وہ مزید پراگندگی کا باعث بنی ہوئی ہے۔ آج ہندوستان کا لسانی اُفق اس سے کہیں زیادہ گرد آلود ہے جتنا کہ ۱۹۵۰ء میں دستور ہند کی تحریر کے وقت تھا۔ ہندی والوں کے لیے انگریزی آج بھی دردِ سر بنی ہوئی ہے۔ اردو والے آج بھی علاقائی اور دوسری سرکاری زبان کے ہیر پھیر میں ہیں۔ مجبور کی پناہ گاہ دستور ہے، دستور خود طلسمِ الفاظ میں محصور ہے، چند نمونے ملاحظہ ہوں:

- دستورِ ہند میں، ہندی کو کسی جگہ ''قومی زبان'' کی ترکیب سے یاد نہیں کیا گیا ہے۔ اسے صرف ''سرکاری زبان''، ''یونین کی زبان'' اور ''یونین کی سرکاری زبان'' کے نام سے پکارا گیا ہے۔ راشٹر بھاشا (قومی زبان) کی 'اپادھی' خود ہندی والوں کی دی ہوئی ہے۔ ۱۹۵۸ء میں زبان کی پارلیمنٹری کمیٹی کے بعض ممبروں نے اسے پر سخت اعتراض کیا تھا۔ اس کو ''راشٹر بھاشا'' کہہ کر ''راشٹر پتا'' اور ''راشٹر پتی'' کی صف میں لا کھڑا

اردو: علاقائی یا دوسری سرکاری زبان

کہا جاتا ہے کہ پانِنی کی سنسکرت قواعد ہندوستانی ذہن کی لسانیاتی ادب کو عظیم ترین پیش کش ہے۔ ہمیں یقین ہے جب یہ قول وضع کیا گیا تھا اس وقت دستور ہند کے سترہویں حصے کے وہ چار باب پیشِ نظر نہ تھے جن کا تعلق "یونین کی سرکاری زبان" اور متعلقہ مسائل سے ہے۔ ابہام وایہام کی یہ مجہول النوع دستاویز ہندوستانی سیاسی فطانت کا ایک ایسا شاہ کار ہے جس کی نظیر لسانیاتی ادب یا دستور سازی کی تاریخ میں ملنا ناممکن ہے۔ ان ابواب میں جن مسائل سے بحث کی گئی ہے وہ خالص لسانیاتی ہیں اور جس انداز اور نوع سے کی گئی ہے وہ سرتا سر سیاسی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ مُلھم پن کا ایک ایسا جال سا بن گیا ہے جس سے ہمارا ہندوستان تا حال نجات حاصل نہیں کر سکا ہے۔ نہ تو مرکزی سرکاری زبان کا مسئلہ اب تک حل ہو سکا ہے اور نہ لسانی اقلیتوں کی زبانوں کا۔ اس کی مختلف دفعات کے ذریعے لسانی شیرازہ بندی کی جو کوشش کی گئی ہے وہ مزید پراگندگی کا باعث بنی ہوئی ہے۔ آج ہندوستان کا لسانی اُفق اس سے کہیں زیادہ گرد آلود ہے جتنا کہ ۱۹۵۰ء میں دستور ہند کی تحریر کے وقت تھا۔ ہندی والوں کے لیے انگریزی آج بھی دردِ سر بنی ہوئی ہے۔ اردو والے آج بھی علاقائی اور دوسری سرکاری زبان کے ہیر پھیر میں ہیں۔ مجبور کی پناہ گاہ دستور ہے، دستور خود طلسمِ الفاظ میں محصور ہے، چند نمونے ملاحظہ ہوں:

⊙ دستورِ ہند میں، ہندی کو کسی جگہ "قومی زبان" کی ترکیب سے یاد نہیں کیا گیا ہے۔ اسے صرف "سرکاری زبان"، "یونین کی زبان" اور "یونین کی سرکاری زبان" کے نام سے پکارا گیا ہے۔ راشٹر بھاشا (قومی زبان) کی 'اپادھی' خود ہندی والوں کی دی ہوئی ہے۔ ۱۹۵۸ء میں زبان کی پارلیمنٹری کمیٹی کے بعض ممبروں نے اسے پر سخت اعتراض کیا تھا۔ اس کو "راشٹر بھاشا" کہہ کر "راشٹر پتا" اور "راشٹر پتی" کی صف میں لا کھڑا

کرانے کی کوشش عمداً کی گئی تھی۔

- ''علاقائی زبانیں'' کی ترکیب صرف باب ۲ کے عنوان کے طور پر آئی ہے۔ لفظ ''علاقہ'' کی کہیں بھی نہ تو تعریف کی گئی ہے اور نہ حد بندی۔ ''علاقہ'' اور ''ریاست'' مترادفات بھی نہیں۔ اس لیے وہ لوگ جو ثانوی سرکاری زبان کے بدلے میں اردو کو علاقائی زبان بنانے کا سودا کر رہے ہیں یا کر چکے ہیں، اس بارے میں بالکل تاریکی میں ہیں۔ اردو، ہندی کے ادیبوں کا لکھنؤ پیکٹ جو ۱۱؍اگست ۱۹۶۷ء میں ہوا تھا۔ دستوری و قانونی نقطۂ نظر سے اردو کے حق میں گھاٹے کا سودا تھا۔ اس کی رو سے ہندی کے ادیب یو۔پی میں اردو کو ''علاقائی زبان'' تسلیم کرنے پر تیار تھے۔ اس بدلے میں کہ اردو کے ادیب ہندی کو اُتر پردیش کی واحد سرکاری زبان تسلیم کر لیں۔ ''علاقائی زبان'' کی دستور کی رو سے نہ کوئی حیثیت ہے اور نہ تعریف! کیا دیا، کیا پایا؟
- باب ۲ کی دفعہ ۳۴۵ کا ذیلی عنوان ''کسی ریاست کی سرکاری زبان یا زبانیں'' ہے۔ اس دفعہ کے تحت ''کسی ریاست کی قانون ساز جماعت کو اختیار ہے کہ قانون کے ذریعے ان زبانوں میں سے، جو ریاست میں بولی جاتی ہوں، ایک یا ایک سے زیادہ زبانوں کو یا ہندی کو اس ریاست کے سب یا بعض سرکاری مقصدوں کے لیے اختیار کرے۔'' اس دفعہ کی رُو سے اردو کا بعض ریاستوں میں دوسری سرکاری زبان بنائے جانے کا جواز پیدا ہوتا ہے۔
- باب ۲ کی دفعہ ۳۴۷ جس کا عنوان ''کسی ریاست کی آبادی کے کسی حصے کی زبان کے بارے میں خاص حکم'' ہے، دراصل لسانی اکثریت کے آمرانہ اقتدار کی روک ہے۔ واضح الفاظ میں کہا گیا ہے: ''اگر اس بارے میں کوئی مطالبہ کیا جائے اور راشٹر پتی کو اس کا اطمینان بھی ہو جائے کہ کسی ریاست کی آبادی کے ایک قابلِ لحاظ حصے کی خواہش ہے کہ وہ ریاست اس زبان کو جسے وہ بولتا ہے تسلیم کر لے، تو راشٹر پتی کو اس کا اختیار ہوگا کہ وہ ہدایت کریں کہ وہ زبان پوری ریاست میں یا اس کے کسی حصے میں ان مقصدوں کے لیے استعمال کی جائے جن کی وہ صراحت کریں۔'' اس دفعہ کا اصل مقصد دفعہ ۳۴۵ کی خرابیوں کو دُور کرنا تھا۔ اردو والوں نے اسے سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے کئی لاکھ کے دستخطوں پر مشتمل محضر راشٹر پتی کو پیش بھی کیا، لیکن اس کا تا حال کوئی

نتیجہ نہیں نکل سکا ہے۔ اس دفعہ کی رُو سے اردو دوسری سرکاری زبان تسلیم کی جاسکتی ہے، علاقائی نہیں۔

اردو کو علاقائی زبان منوانے کی تجویز اس غلط فہمی پر بھی مبنی ہے کہ شیڈول نمبر ۸ میں جو چودہ (اب پندرہ) زبانیں گنائی گئی ہیں وہ علاقائی زبانیں ہیں، یہ صحیح نہیں۔ شیڈول پر عنوان کے طور پر صرف ''زبانیں'' لکھا ہوا ہے، اور ان زبانوں میں سنسکرت اور سندھی بھی شامل ہیں جن کا کوئی علاقہ نہیں۔ دراصل فہرست سرکاری زبان کے اس کمیشن کے سلسلے میں دی گئی ہے جو صدر جمہوریۂ ہند کی ہدایت پر ہر پانچویں سال ہندی کی رفتار ترقی کا جائزہ لینے کے لیے مقرر ہوگا اور جس کا ذکر دفعہ ۳۴۴ (الف) میں کیا گیا ہے۔ اس کمیشن کے ممبر ہندی کے علاوہ ان زبانوں سے بھی لیے جائیں گے۔ شیڈول نمبر ۸ میں گنائی جانے والی زبانوں کی اس سے زیادہ اہمیت نہیں۔

اب فیصلہ کر لیجیے کہ اردو والوں کی مانگ کیا ہونی چاہیے، علاقائی زبان یا دوسری سرکاری زبان؟ ''علاقائی زبان'' دستور کا محض ایک عنوان ہے، ''سرکاری زبان'' دستور کی اصل حقیقت اور جان ہے۔

(اداریہ ۸/مارچ ۱۹۷۰ء)

ooo

ضمیمہ

بھارت میں اردو کشی

رام پرکاش کپور

جو آزادی سے پہلے بھی مشترکہ زبان تھی، جس نے تحریکِ آزادی انقلاب زندہ باد اور، جھنڈا اُونچا رہے ہمارا، جیسے جوشیلے نعرے اور سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا جیسے قومی ترانے دیئے جسے ہر فرقے کے لوگ بولتے تھے اور سمجھتے تھے، جو شاہی محلوں سے لے کر گلیوں کوچوں اور بازاروں تک بولی اور سمجھی جاتی تھی جو کامروپ سے کاٹھیاوار تک اور کشمیر سے کنیا کماری تک رابطہ کی زبان کے طور پر سمجھی اور استعمال کی جاتی تھی اسے مذہب کے تنگ دائرے میں قید کر کے ایک خاص فرقے کی زبان کا درجہ دے دیا گیا۔

عام طور پر اردو اخبارات اور اہلِ اردو اس کے لیے سرکاری پالیسیوں کو ذمے دار ٹھہراتے ہیں مگر اردو داں طبقہ اور اردو مادری زبان والوں کو بھی اس زبوں حالی سے بری الذمہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ وہ بھی اس کے ذمہ دار ہیں۔

حکومت کی طرف سے تو اردو کشی کا کام آزادی کے فوراً بعد ہی شروع ہو گیا تھا۔ سارے شمالی ہندوستان اور خاص کر کے یو پی میں لکھنؤ جیسے شہروں میں راتوں رات سڑکوں کے نام بدل دیئے گئے تھے۔ چھ مہینوں کے اندر اندر ہزاروں اردو میڈیم اسکول بند کر دیئے گئے یا ان کا میڈیم بدل دیا گیا تھا۔ باقی تمام سرکاری اسکولوں، کالجوں سے بھی اردو خارج از نصاب کر دی گئی۔ تمام ریلوے بک اسٹالوں سے اردو کتاب و رسائل غائب ہو گئیں اور ریلوے میں سفر کرنے والے مسافر اردو کتاب یا رسالہ پڑھنے سے گھبرانے لگے۔ کیونکہ یہ ایک خاص قوم کی شناخت بن چکی تھی۔ یہیں پر بس نہیں ہوا بلکہ اس زمانے میں اردو کا مطالعہ کرنے والا اینٹی نیشنل سمجھا جاتا تھا اور خفیہ پولیس اس کے گھر ارد گرد چکر کاٹنا شروع کر دیتی تھی۔ عوامی سطح پر بھی اردو دشمنی عام ہو گئی

تھی۔ ہوا یوں کہ شمالی ہندوستان کے مسلمانوں کے ساتھ اردو زبان کے بارے میں بھی یہ رائے قائم کرلی گئی تھی کہ یہ زبان تقسیم کی ذمہ دار ہے۔ یہ گمراہ کن پروپیگنڈہ چند شر پسند سیاسی ذہنوں کی شعوری کوشش کا نتیجہ تھا۔ بھولے بھالے عوام ان کی باتوں میں آ گئے اس منفی اور شرارت آمیز تصور کے زیرِ اثر بے گناہ اردو بھی معتوبین کی صف میں لاکر کھڑی کردی گئی اور یہ سازش کچھ اس شاطرانہ انداز سے کی گئی تھی کہ اردو اور مسلمان برسوں تک صفائی پیش کرتے رہے، لیکن حملہ کچھ ایسا نفسیاتی اور منظم تھا کہ اردو والے حواس باختہ ہو گئے۔ پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جب دھند چھٹی تو ہندوستان کا سارا منظر نامہ ہی بدل چکا تھا اور اردو نا قابلِ تلافی نقصان برداشت کرچکی تھی۔ ایک پوری نسل اردو رسم خط سے بے بہرہ ہو چکی تھی۔

جب ۱۹۵۰ء میں آزاد ملک کا دستور بنا تو اسے حق انصاف پر مبنی ہونا تھا چنانچہ اردو کو بھی قومی زبانوں کی فہرست میں جگہ ملی اور اس کے لیے دیگر ضروری گنجائش بھی رکھی گئی۔

مگر افسوس کہ چند سیاسی لیڈروں اور نوکر شاہوں کی متعصبانہ ذہنیت کی وجہ سے یہ واضح دفعات بھی اردو کو ملکی اور تعلیمی نظام اب ووٹ بنک کی سیاست کے زیرِ اثر تمام سیاسی پارٹیاں اس کا جائز حق نہ دلا سکیں۔ مسلمانوں سے کچھ وعدے کرتی ہیں۔ گو الیکشن کے بعد سب یہ وعدے بھول جاتے ہیں، لیکن میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ خود اردو والوں نے اپنے بل بوتے پر پچھلے پچاس سال میں اردو کے لیے کیا کِیا ہے؟

آزادی کے بعد آج تک اردو کے حق میں کوئی لڑائی نہیں لڑی گئی اردو کے لیے صرف حکومت سے بھیک مانگی گئی ہے۔ ہزاروں دستخطوں کے ساتھ درخواستیں دی گئی ہیں۔ بھیک مانگنا موت کی علامت ہے اور حق کی لڑائی لڑنا زندگی کی علامت ہے۔ اب فیصلہ اردو والوں کو کرنا ہے کہ ان کو موت کے راستے پر چلتے رہنا ہے یا زندگی کا ثبوت فراہم کرنا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اردو والوں کی بھیک پر بھی سرکار نے بادل نخواستہ ان کی جھولی میں کبھی کبھی بھیک ڈال بھی دی ہے۔ مثلاً بہار کے کچھ اضلاع میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا اسی طرح بڑی منت سماجت کے بعد اُتر پردیش میں بھی دوسری سرکاری زبان بنانے کا اعلان کیا گیا، لیکن عمل درآمد نہ ہو سکا، آرڈیننس ہائی کورٹ میں زیرِ سماعت ہے۔ گورنمنٹ جلدی فیصلے میں دلچسپی نہیں رکھتی اور جو ناانصافیاں ہو رہی تھیں جاری ہی ہیں، دِلّی میں بھی حال ہی میں اسی ووٹ کی سیاست کے زیرِ اثر ہی مسلمانوں کی خوشنودی کے لیے آنجہانی اندرا گاندھی نے کئی

ریاستوں میں اردو اکادمیاں قائم کر دی تھیں، لیکن اس سے اردو زبان و ادب کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ وہاں البتہ کچھ لوگوں کی روزی روٹی کا سامان ضرور مہیا ہو گیا تھا۔ اردو اکادمیوں کے بارے میں جانے مانے ادیب آنجہانی شمس کنول نے ماہنامہ کتاب نما میں کچھ سال پہلے اپنے اداریہ میں لکھتے ہوئے انہیں اردو کی سمادھیاں کہا تھا انہوں نے لکھا تھا یہ اچھا کام بھی ہمارے سیاستدانوں کے ہاتھ سے انجام پایا ہے کہ انہوں نے اردو کی چتا سے پھول چنے ہیں اور ملک کی تقریباً سب ریاستوں میں اردو اکادمی کے نام سے اردو کی ایک ایک سمادھی بنا دی ہے۔ یعنی پنڈت نہرو سے لے کر راجیو گاندھی تک ایک طے شدہ منصوبے کے تحت انتہائی ہوشیاری سے اردو کی جڑ کاٹی گئی ہے اور اردو اکادمیاں قائم کر کے اردو کے پودوں کو پانی دیا گیا ہے تقریباً سبھی اردو اکادمیاں بد انتظامی، بدنظمی، تنگ نظری، کوتاہ اندیشی، ہنر ناشناسی، ناقدری، بدعہدی، بدخواہی، بدنیتی، فرض ناشناسی، بداطواری، ڈھٹائی، ہٹ دھرمی، دھاندلی، بددیانتی، ناقص کارکردگی اور سو بات کی ایک بات ووٹ حاصل کرنے کی سیاست میں مبتلا ہے۔ انہوں نے آگے لکھا ہے دراصل ہماری اردو اکادمیاں یہ چھوٹا بھرم بنائے رکھنے کے لیے تو کوشاں ہیں کہ بھارت جیسے سیکولر دیش میں اقلیت کی زبان محفوظ ہے مگر درحقیقت وہ اردو زبان کی بقاء اور اردو کے فروغ کے لیے کچھ نہیں کرتے۔ (ماہنامہ ''کتاب نما''، جولائی ۱۹۹۴ء)

اس اداریے کے لکھے ہوئے دس سال ہونے کو آئے ہیں، لیکن اردو اکادمیوں کی کارکردگی میں کوئی سدھار نہیں ہوا۔ میں قنوطیت پسند نہیں ہوں مگر حقیقت سے چشم پوشی کر کے ہم خود کو تو دھوکہ دے سکتے ہیں، لیکن مسائل کو نہیں بڑے بڑے سیمینار سمپوزیم، مشاعرے منعقد کر کے یا جدیدیت، مابعد جدیدیت، ساختیات پسِ ساختیات جیسے موضوعات پر بحث کر کے کچھ لوگ اپنا مقصد تو پورا کر سکتے ہیں مگر اس زبان کا مسئلہ حل نہیں ہوتا اردو کا کوئی بھلا نہیں ہوتا۔

ہندوستان کے تمام بڑے شہروں میں ہزاروں مشاعرے منعقد ہوتے ہیں۔ غالب اور اقبال کے نام پر مضامین و تقریبات نیز کتابوں کی بھرمار ہیں مگر زبان کے مسئلہ پر سوچنے کی فرصت کسی کو نہیں ہے۔ اردو کے نام پر بنی اکادمیاں حکومت سے کروڑوں روپیہ پا رہی ہیں۔ انہوں نے ملک میں اردو کی بقاء کے لیے کیا کیا ہے؟

کیا چند انعامات اور اشاعتی امداد دے کر اس مسئلہ کو حل کیا جا سکتا ہے؟ مدیر گلبن احمد آباد نے اپنے ایک اداریے میں لکھا تھا کہ گجرات اردو اکادمی کا سارا کام گجراتی میں ہوتا ہے۔

مئی جون کے شمارہ میں انہوں نے پھر اکادمی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے دو تین ماہ قبل گجرات اردو اکادمی کی تشکیل ہوئی جس میں چند نئے ارکان کے علاوہ باقی سب وہی پرانے چہرے ہیں۔ اس نئی انتظامیہ نے سب سے پہلا کام گرو پرسکار دینے کا کیا ہے۔ پورے ملک میں کوئی بھی سرکاری ادارہ ایسا نہ ہوگا جس نے اردو ایوارڈ کا نام سنسکرت میں رکھ چھوڑا ہو یہ گجرات اردو اکادمی کا ہی کمال ہے کہ اس نے سرکاری ایوارڈ کا نام گرو پرسکار رکھا ہے۔ وارث علوی کے لیے یہ کرو کی بات وہ سکتی ہے ہمیں تو شرم آتی ہے کہ کم از کم ایوارڈ کا نام تو اردو میں یا اردو کے تعلق سے رکھا ہوتا، لیکن کیا کیجیے گا انہی میں وہ لوگ بھی ہیں جو احمد آباد کا نام جب گجراتی میں لکھتے یا بولتے ہیں تو اسے امداد ادا کر دیتے ہیں۔ ان کے لیے نام میں کیا رکھا ہے، لیکن ہمارے لیے تو ہماری شناخت ہی اس مذموم حرکت سے داؤ پر لگ جاتی ہے۔

گجرات اردو، اکادمی کے جناب وارث علوی اس معاملے میں اکیلے نہیں ہیں ان کے اور بھی بہت سے ساتھی ملک کی دوسری ریاستی اردو اکادمیوں میں بھی موجود ہیں۔

کچھ عرصہ قبل مدھیہ پردیش اردو اکادمی کا ایک سیمینار بلاسپور میں منعقد ہوا تھا اس کی ایک رپورٹ خورشید حیات نے رسالہ سہ ماہی ''مژگان'' کلکتہ میں شائع کرائی ہے انہوں نے لکھا ہے ہر صوبہ کی طرح مدھیہ پردیش میں بھی اردو اکادمی ہوا کرتی ہے جس میں زیادہ تر کام ہندی میں ہوا کرتا ہے۔ گزشتہ سال ۱۳ نومبر کو ایک سیمینار غزل اکیسوی صدی میں، مدھیہ پردیش اردو اکادمی کی طرف سے بلاسپور میں ہوا تھا۔ دعوت نامہ مجھے بھی ملا تھا اردو میں جس میں سینچر ''ٹ'' سے لکھا تھا سیمینار 'ٹ' سے لکھا تھا اور بھی بہت کچھ سیمینار کے عنوانات تھے۔ اس سیمینار مشاعرے میں ندا فاضلی، ممتاز ارشد، افتخار امام صدیقی، زبیر رضوی شریک تھے۔

کم از کم ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر عام اہلِ اردو نے ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں نے بھی اپنی بیداری، خود اعتمادی، حیثیت اور اپنی زبان سے لگن اور وفاداری کا ثبوت دیا ہے اور وہ ہے رسم خط میں تبدیلی۔

ایک دو ادیبوں، دانشوروں کو چھوڑ کر سب نے اتفاق رائے سے دیوناگری یا رومن رسم خط قبول کرنے کی پرزور مخالفت کی ہے، لیکن جو کام براہ راست نہیں ہو سکا وہ ادیبوں، شاعروں کی بے حسی اور خود غرضی کی وجہ سے چور دروازے سے ہو رہا ہے۔ آج اکثر ادیب و شاعر کی تخلیقات پہلے دیوناگری رسم خط میں شائع ہوتی ہیں بعد میں اردو میں یہی نہیں بلکہ دیوناگری میں دو ہزار

جلدیں شائع ہوتی ہیں، لیکن اردو میں صرف دو ڈھائی سو شاید مارکیٹ کا تقاضا ہے، لیکن اردو کی جڑ تو کٹ رہی ہے۔

اردو رسم خط کی تحریک تو خود اپنی موت مر جائے گی کیونکہ جن لوگوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس رسم خط کی سفارش کی جاتی ہے ان کی اکثریت ہی اردو زبان سے ناواقف ہے۔

سکھ عالم فاضل ہو یا ایسا اَن پڑھ جس نے اسکول کا منہ نہ دیکھا ہو، ڈاکٹر، انجینئر ہو یا ٹیکسی ٹرک ڈرائیور ہو، مزدور ہو یا میکینک وہ اپنے ماں باپ اور رشتے داروں کو گورمکھی میں ہی خط لکھتا ہے اور اس کے لیے اسے کسی اسکول کی تعلیم کی ضرورت نہیں، کیونکہ وہ گورمکھی ماں کی گود میں سیکھتا ہے۔

بچپن میں اپنے مذہب اور گوربانی سے اس کا تعارف گرمکھی سے ہوتا ہے اردو والے ایسا کچھ انتظام نہیں کر سکتے؟

OOO

ماخذ

پہلا حصہ: ۱۔ ''ہماری زبان کا نام''

یہ تقریر آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کے شعبۂ اردو میں ۲۹ / مارچ ۱۹۳۷ء کی رات کو اسٹریچی ہال مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں کی گئی۔

''نقوشِ سلیمانی'' از۔ علامہ سیّد سلیمان ندوی

پاکستانی دوسرا ایڈیشن ۱۹۶۷ء۔ ناشر۔ اردو اکیڈمی سندھ (کراچی)

۲۔ ''گاندھی جی کی ہندوستانی سبھا''

(اقتباس) ''پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ترقی اردو''، مرتبہ: سیّد ہاشمی فرید آبادی

اشاعت بار اوّل ۱۹۵۳ء، ناشر۔ انجمن ترقی اردو پاکستان (کراچی)

۳۔ ''اردو سے ہندی تک''

(اقتباس) ''اردو سے ہندی تک''، از۔ ڈاکٹر عبدالودود

پاکستان میں بار اوّل ۱۹۸۴ء، ناشر: مجلس فکر و ادب کراچی

۴۔ ''اردو ہندی تنازع کے آخری دس سال'' (۱۹۳۷ء تا ۱۹۴۷ء)

(اقتباس) ''ہندی اردو تنازع'' (ہندو مسلم سیاست کی روشنی میں)

از۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری، طبع اوّل ۱۹۷۶ء۔ طبع دوم ۱۹۸۸ء۔

ناشر: نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد۔

دوسرا حصہ : ۱۔ ''مہاتما گاندھی اور بھاشا کا سوال''
(اقتباس) ''لسانی مطالعے'' از۔ ڈاکٹر گیان چند
پہلا ایڈیشن جنوری ۱۹۷۳ء۔ ناشر: نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا نئی دہلی

۲۔ ہندوستانی، ہندی اور اردو۔ از۔ موہن داس کرم چند گاندھی
رسالہ ''جامعہ''، مدیر شمیم حنفی، جلد نمبر ۹۷، شمارہ ۱۰-۱۲ اکتوبر، دسمبر ۲۰۰۰ء،
ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔

۳۔ ''ہندوستان کی قومی زبان۔ ہندوستانی''۔ از۔ موہن داس کرم چند گاندھی،
رسالہ ''جامعہ''، مدیر شمیم حنفی، جلد نمبر ۹۷، شمارہ ۱۰-۱۲ اکتوبر، دسمبر ۲۰۰۰ء، ذاکر
حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔

۴۔ ''اردو ہندی ایک تاریخی جائزہ''۔ از۔ جاوید اختر بھٹی
اشاعت اوّل جنوری ۱۹۸۵ء، ناشر: ادارہ ''لوح و قلم''، ملتان۔

تیسرا حصہ : ''اردو کا المیہ'' از۔ مسعود حسین خان (پروفیسر و صدر شعبۂ لسانیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) مرتبہ: مرزا خلیل احمد بیگ۔ ناشر: شعبۂ لسانیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (انڈیا) سال طباعت اوّل، مارچ ۱۹۷۳ء۔
''اردو کا المیہ'' مسعود حسین خاں کے اداریوں اور انشائیوں کا مجموعہ ہے جو کہ ''ہماری زبان'' (علی گڑھ) میں شائع ہوئے۔ آٹھ اداریوں کا انتخاب اس کتاب میں پیش کیا جا رہا ہے۔

۱۔ مہاتما جی نے کیا سوچا تھا؟ (ص: ۵۰ تا ۵۴)
۲۔ ہندوستان پر چار سبھا (ص: ۷۰ تا ۷۳)
۳۔ اردو رسم خط (ص: ۷۴ تا ۷۷)
۴۔ اردو ہے جس کا نام (ص: ۷۸ تا ۸۳)
۵۔ اردو بنام ہندی (ص ۸۸ تا ۹۲)

۶۔ ۱۹۷۱ء کی مردم شماری اور اردو (ص: ۹۸ تا ۱۰۲)

۷۔ دل اور دے ان کو (ص: ۱۰۳ تا ۱۰۷)

۸۔ اردو، علاقائی یا دوسری سرکاری زبان (ص ۱۲۳ تا ۱۲۶)

ضمیمہ: بھارت میں اردو کشی۔ از۔ رام پرکاش کپور (ہریانہ، انڈیا)
(کپور صاحب نے یہ مضمون نیویارک میں قیام کے دنوں میں لکھا)
مطبوعہ: ماہنامہ ''مسیحائی'' (کراچی) مدیر: ڈاکٹر حافظ حقانی میاں قادری
جلد نمبر ۶، شمارہ ۷/۸۔ جولائی، اگست ۲۰۰۳ء۔

مطبوعاتِ جاوید

افسانے:

۱۔ چاند کے زخم
۲۔ مگر تم زندہ رہنا
۳۔ رَبی رات

ادبی کالم:

۱۔ حاشیے
۲۔ مزید حاشیے (زیرِ طبع)

تحقیق، ترتیب و تہذیب:

۱۔ جوئبار (ظفر ادیب کا پہلا مجموعہ کلام)
۲۔ ابرِ گہربار (بالکشن تبرہ ابر ملتانی۔ شخصیت و شاعری)
۳۔ فلسفۂ مذہب (پانچ مضامین کا انتخاب)
۴۔ فیضانِ آزاد (نگارشاتِ ابوالکلام آزاد سے انتخاب)
۵۔ مرزا عظیم بیگ چغتائی (فن و شخصیت)
۶۔ اردو ہندی ایک تاریخی جائزہ (نیا ایڈیشن اضافے کے ساتھ)
۷۔ بیس نامور ادبی شخصیات
۸۔ ''الہلال اور البلاغ کے اشارات و مباحث'' (زیرِ طبع)
۹۔ تیس یادگار ادبی شخصیات (زیرِ طبع)